ناول گئودان اور کائر کا تقابلی مطالعہ

مقالہ برائے

ایم-فل

مقالہ نگار

رجیش پانگوٹل

نگراں

پروفیسر حبیب نثار

شعبۂ اردو اسکول آف ہیومانٹیز

یونی ورسٹی آف حیدرآباد

حیدرآباد-500046

2018

فہرستِ ابواب

پیش لفظ	4
(1) بابِ اول	
شخصیت اور فن	7
(ا) تکشی شیوشنکر پلائی	9
(ب) پریم چند	17
(2) بابِ دوم	
ناول کی روایت	26
(ا) ملیالم ناول کی روایت: تکشی کا دور اور اس سے قبل	27
(ب) اردو ناول کی روایت: پریم چند کا دور اور ان کے قبل	47
(3) بابِ سوم	
ناول "گئودان اور کائر" کا تقابلی مطالعہ	63
(ا) ناول "گئودان اور کائر" کا فنی تجزیہ	66
(ب) ناول "گئودان اور کائر" کا موضوعاتی تجزیہ	91
(4) بابِ چہارم	
ماحصل	103
کتابیات	107

پیش لفظ

پیش لفظ

سماجی مسائل کو پیش کرنے والی ادبی تخلیقات ہر دور میں اہمیت رکھتی ہے۔ادیبوں نے آزادی، استحصال جیسے مسائل کو بیان کرنے میں کامیاب کوشش کی ہے۔

میں نے اس تحقیقی مقالہ میں دو مختلف زبانوں کے ناولوں پر روشنی ڈالی ہیں۔اس مقالہ میں ملیالم ادب کے نامور ناول نگار تکشی شیو شنکر پلائی کے ناول "کائر" اور اردو ادب کے مشہور ناول نگار پریم چند کا شاہکار ناول "گئودان" کے تقابلی مطالعہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

ہندوستانی ادب کی روایت پر نظر ڈالی جائے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان کی سر زمین سیاسی، سماجی، معاشی۔ معاشرتی اور ثقافتی اعتبار سے بہت ہی متنوع ہے۔اس تنوع میں اتحاد بر قرار رکھتے ہوئے ہی عوام یہاں کی تہذیب اور تمدن کا تحفظ کرتے ہیں۔اس اتحاد کو ہم ہندوستان کے ادب میں واضح طور پر دیکھ سکتے ہیں۔

انسانی فطرت کے مختلف انداز کو اس کے حقیقی معنوں میں پیش کرنے والے اردو ادب کے عظیم تخلیق کار پریم چند کی مایہ ناز تصنیف "گئودان" اور عام آدمی کی زندگی اور ریاستِ کیرالا کے کوٹاناڈ کے کاشتکاروں کی زندگی کو ملیالم ادب سے متعارف کروانے والے تکشی شیو شنکر پلائی کے ناول "کائر" تقابلی مطالعہ کے لئے ممکن اور بے حد مناسب ہیں۔

بیسویں صدی کو ہر اعتبار سے تبدیلیوں اور انقلابات کی صدی کہنا غلط نہیں ہو گا۔ بیسویں صدی میں زندگی کے شعبے میں تبدیلیاں اور انقلابات آئے چاہے وہ سماجی ہوں، ثقافتی ہوں، سیاسی ہوں، معاشی ہوں یا پھر انفرادی۔۔ ہر شعبہ حیات اس تبدیلی اور انقلاب سے متاثر ہوا ہے۔ادب کی رو سے دیکھا جائے اردو ادب

میں بھی اس دور میں کئی انقلاب انگیز تحریریں سامنے آئیں جن میں پریم چند کی تحریروں کا خاص ذکر ملتا ہے۔ اسی طرح ملیالم ادب میں تکشی شیو شنکر پلائی کی ناولوں کا شمار ہوتا ہے۔ان دونوں ناول نگاروں کی تخلیقات بیسوں صدی میں لکھی گئی ہیں پھر بھی آج کے اس اکیسویں صدی میں جینے والے لوگوں کے لئے بھی ان میں فکری اسباق اور سماجی مسئلہ کو حل کرنے کے راستے دکھائے گئے ہیں۔ان دونوں قلم کاروں کے ناول کے تقابلی مطالعے سے انہیں باتوں کو اخذ کیا گیا ہے اور یہی اس مطالعے کی اہمیت ہے۔

گؤدان اور کائر کے تقابلی جائزہ لینے سے دو مختلف ادبی زبانوں کی خصوصیات کے ساتھ ساتھ دونوں تخلیقات کا دور اور زبان کے افتراقات کا جائزہ بھی لیا جاسکتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ دونوں ادیبوں کے انداز تحریر اور ان کے فکری اشتراک کو بھی قارئین کے سامنے پیش کیا جاسکتا ہے۔انہیں حقائق کو سامنے لانے کے ہی اس تقابلی مطالعہ کیا گیا ہے۔

دنیا کی بقا کا سہرا محنت کش طبقے کے سر ہے۔ہر سماج میں ان کی اپنی سماجی، معاشی و ثقافتی خصوصیات ہوتی اور ان کے کاشتکاری نظام کا اپنا منفرد انداز ہوتا ہے۔ایک ادیب یا ناول نگار اپنے سماج کے اس سماجی ، معاشی اور ثقافتی انفرادیت کو قائم رکھنے کے لئے اپنی تخلیقات میں پیش کیا ہے۔

میں نے اپنے نگران پرفیسر حبیب نثار صاحب کے مشورے سے اس مقالے کو تین ابواب میں تقسیم کیا ہے۔

بابِ اول "شخصیت اور فن" کے عنوان سے ہے۔اس باب میں تکشی شیو شنکر پلائی کی شخصیت اور فن اور پریم چند کی شخصیت اور فن کا جائزہ لیا گیا ہے۔

بابِ دوم " ناول کی روایت " کے نام سے شامل ہے۔اس باب میں ملیالم ناول کی رویت اور تکشی کا دور اور اس سے ما قبل ناول نگاروں کا مختصر جائزہ لیا گیا ہے اور اسی طرح اردو ناول کی روایت اور پریم چند کے دور اور ان کے ما قبل کا بھی مختصر جائزہ لیا گیا ہے۔

بابِ سوم کا عنوان "ناول گؤدان اور کائر کا تقابلی مطالعہ" ہے۔ اس باب میں گؤدان اور کائر کا فنی اور موضوعاتی تقابل کیا گیا ہے۔

آخر میں ماحصل کے عنوان سے اس مطالعہ کی تلخیص پیش کی گئی ہے۔

مقالے کے تکمیل صرف ریسرچ اسکالر سے ممکن نہیں، اس میں اساتذہ کرام اور نگراں کی رہنمائی اور تعاون کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں اپنے نگراں پروفیسر حبیب نثار صاحب کا بے حد شکر گزار ہوں کہ انھوں نے مجھے مفید مشوروں سے نوازا۔

میں شعبہ اردو کے تمام اساتذہ کرام کا شکر گزار ہوں۔ اور اپنے دوست و احباب میں ریشمہ، امان، کفیل اور رسینہ وغیرہ کو بھی شکر گزار ہوں۔

رجیش پانگوٹل

تاریخ: **شعبہ اردو، یونی ورسٹی آف حیدرآباد**

بابِ اوّل

شخصیت اور فن

ناول "گؤدان اور کائر" کا تقابلی مطالعہ

ادب اپنے عہد کی سماجی، سیاسی، معاشی و ثقافتی صورتحال کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ فنکار اور ان کے فن پاروں کا خراج، اس کے موضوعات اور اس کی ہیئت ہر دور میں بدلتی رہتی ہے۔ پریم چند کا "گؤدان" اور تکشی کا ناول "کائر" کے ساتھ ساتھ سماج کے دبے کچلے لوگوں، مزدوروں اور کسانوں کی زندگی بیان کرتے ہیں۔

کسانوں، مزدوروں اور سماج کے نچلے طبقے کے افراد کی سماجی زندگی سے متعلق لکھے گئے ان دونوں ناولوں کا جائزہ لیتے ہوئے تکشی شیو شنکر پلائی اور پریم چند کی شخصیت، ان کا فن اور ان کے خصوصیات کو جاننے کے لئے ان دونوں فن پاروں کا مطالعہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

تکشی شیوشنکر پلائی

ریاستِ کیرالا میں ضلع آلپوّیا کے قریب تکشی گاؤں میں ''پٹوارم اریپورت''
گھرانے میں 17 اپریل 1912ء میں تکشی پیدا ہوئے۔ ان کا پورا نام شیوشنکر پلائی ہے۔ ان کے
والد کا نام پویاپلی کلتیل شنکر اکروپ اور والدہ کا نام پاروتی تھا۔ تکشی آپ کا قلمی نام ہے(1)

تکشی کی ابتدائی تعلیم انہی کے گاؤں کے ایک ملیالم اسکول میں ہوئی۔ انھوں نے چوتھی جماعت تک وہیں پر تعلیم حاصل کی تھی۔ اس کے بعد امبلہ پویا کے کڈپورم انگریزی اسکول میں ساتویں جماعت تک کی تعلیم حاصل کی۔ ساتویں جماعت کے بعد ویکم اسکول سے انھوں نے اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ ہائی اسکول سے فراغت حاصل کر لینے کے بعد ان کی خواہش تھی کہ وہ کالج میں داخلہ لیں اور ڈگری کی تعلیم حاصل کرے۔ لیکن ان کی یہ خواہش پوری نہ ہو پائی۔ اس دوران انہوں نے تروونتاپورم (Trivandrum) لا کالج میں داخلہ لے کر پلیڈرشپ کا کورس پورا کیا۔

طالب علمی کے زمانے میں ہی تکشی اپنی ادبی زندگی کا آغاز کر چکے تھے۔ شروع شروع میں کے-کے شیوشنکر پلائی نام سے مختصر کہانیاں لکھتے رہے۔ 1929ء میں ان کی کہانی ساڈّگل (غریبوں) این۔ایس۔ ایس کی سروس میگزین میں شائع ہوئی۔ یہ کہانی تکشی کی پہلی

1- سوانح عمری تکشی- ص-16

مطبوعہ کہانی کہلائی۔ ترو ونتاپورم میں رہنے کے دوران تکشی کی زندگی میں کافی تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔اس دور میں تکشی کو اپنے عہد کے بڑے بڑے ادیبوں، نقادوں، سیاسی لیڈروں اور دیگر اہم شخصیات سے ملنے کا ایک سنہرا موقعہ ملا۔

ملیالم کے مشہور نقاد کیسری بالکر شنن پلائی سے ملاقات نے تکشی کی ادبی زندگی کو نیا موڑ دیا۔ ان کی صحبت کی بدولت ہی انھیں ملیالم میں کہانیاں لکھنے کی رغبت ہوئی۔ ان کی یہ تمام کہانیاں کیسری اخبار میں شائع ہونے لگیں۔ ترو ونتاپورم کے دوران قیام تکشی کو زندگی کے مسائل اور انسان کے اٹوٹ رشتوں کے مختلف پہلوؤں کو بہت قریب سے دیکھنے بھالنے اور سمجھنے کا زرین موقعہ ملا۔وہاں کے کتب خانے نے ان کے مطالعہ کا شوق پروان چڑھایا۔ ترو ونتاپورم کی پبلک لائبریری اور کیسری بالکر شنن پلائی کے ادبی مجالس نے تکشی کی ادبی زندگی کی نشوونما میں اہم رول ادا کیا۔ انہوں نے اپنی سوانحی کہانی ”اینٹے وکیل جیوتم“ (میرے وکالت کے دن)میں لکھا ہے کہ،" ترو ونتاپورم شہر نے مجھے اپنا بنالیا"۔([2]) یہاں تکشی انے پلیڈرشپ کا امتحان پاس کیا اور 1934ء میں انہوں نے کملاکشی امّا سے شادی کی۔ تکشی انھیں "کاتا" پکارتے تھے۔ کاتا ایک دیہی عورت تھی۔ وہ محنت کش اور شوہر پرست تھی۔ وہ اپنے شوہر کی ادبی زندگی میں بہت ترقی چاہتی تھی۔ وہ اپنے شوہر کی ادبی زندگی میں کسی طرح کی بادھاڈالنا نہیں چاہتیں تھی([3]) جبکہ وہ خود صرف پانچ درجہ کی تعلیم عاصل کی تھی لیکن وہ کہانیاں پڑھتی رہتی تھی۔ تکشی کو کاتا کے ذوق اور ادبی شعور پر بھروسہ تھا اسی وجہ سے وہ اپنی

---

[2]-اینٹے وکیل جیوتم-ص-22

[3]-سوانح عمری تکشی-تکشی-318

اپنی ہر کہانی لکھتے کے بعد کاتا کو پڑھنے دیا کرتے تھے۔ کاتا کے بارے میں تکشی نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ "میری زندگی کو باترتیب اور بامنظم بنایا ہے"۔ ([4])

تکشی کا پہلا ناول "قربانی کا صلہ" (Reward for sacrifice) کملالیہ پریس نے شائع کیا۔ اس ناول میں تکشی نے تروونتاپورم کی اپنی زندگی کے تجربات بیان کئے ہے۔ یہ ناول تکشی کی ادبی زندگی میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے بعد تکشی نے جلد ہی سے اپنا دوسرا ناول "گرا ہوا کنول" لکھا۔ یہ بھی بی-وی بک ڈپو نے شائع کیا-([5]) اس زمانے میں ناول" قربانی کا صلہ" کو زیادہ اہمیت اور شہرت ملی اور عام لوگوں میں یہ ناول کی ہیت اور مقبولیت حاصل کیا۔ اور 1934 میں بی-وی بک ڈپو نے تکشی کی مختصر کہانیوں کا مجموعہ "پوتو ملر" (new blossoms) شائع کیا۔

تکشی نے ابتدائی دور میں ہی فرائڈ اور بارٹن کے فلسفوں کا مطالعہ کر لیا تھا۔ ان کے افکار نے تکشی کو اپنی زندگی کے بے انتہا متاثر کیا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ تکشی نے اپنی تخلیقات میں ترقی پسند فکر کو بھی شائع کیا۔ تکشی کا ماننا تھا کہ ادب کو عوام اور ملک سے جڑا ہوا ہونا چاہئے۔ تکشی کا کہنا تھا کہ ادب کے قدیم طرزِ تحریر کو بہتر بناتے ہوئے آنے والی نسل اور عصری ضرورتوں کے مطابق اسے ترقی کی طرف گامزن کرنا چاہتے۔

تکشی نے تروونتاپورم سے پلیڈر شپ کورس کامیاب کرنے کے بعد امبلاپویا عدالت میں وکالت شروع کی۔ ([6]) وکالت اور ادبی زندگی ایک ساتھ لئے وہ آگے بڑھے۔ اور اپنی وکالت کی زندگی کے بارے میں انہوں نے "اینٹے وکیل جیوتیم" (میرے وکالت کے دن)

---

[4]- اور مکلوڑے تیر نگلیل (یادوں کا ساحل)-ص-33

[5]- سوانح عمری تکشی-تکشی-ص-305

[6]- اینٹے وکیل جیوتم-

نام سے ایک کتاب بھی لکھی ہے۔ تکشی نے اپنی ادبی زندگی شاعری سے شروع کی لیکن انھیں بہت گہرا احساس ہوا کہ شاعری ان کی فرطت سے ہم آہنگ نہیں چنانچہ انہوں نے نثر ہی کو اپنی تخلیقات کے لئے اپنا لیا۔ وکالت اورادبی زندگی دونوں ایک ساتھ ہی چلتے رہے۔ وکالت کے ذریعہ انہوں نے وہاں کے مزدوروں اور یونین کے لوگوں سے تعلق قائم کیا۔ اور کسانوں، مچھواروں اور نچلے طبقے کی طرز زندگی اور ان کے مسائل کا گہرا مطالعہ کیا۔ ان تمام مسائل کے نقوش ان کی کہانیاں میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ زمیندار سماجی زندگی اور عوام کی معیشت کا کس طرح استحصال کر رہے تھے، اس کی بہترین عکاسی ان کے ناولوں، کہانیوں اور دیگر تحریروں میں ظاہر ہوتی ہے۔ اس دوران تکشی نے ملیالم ادب کے ترقی پسند مصنفین کی جماعت کے سکریٹری کی حیثیت سے نمایاں خدمات انجام دئیں۔ انہوں نے اپنی وکالتی زندگی کے پندرہ سال بعد وکالت چھوڑ کر تصنیف و تالیف میں پوری طرح مصروف ہو گئے۔ تکشی نے اپنے سوانح عمری میں لکھا ہے کہ "مجھے وکالت پیشہ بالکل پسند نہیں تھا"۔ ([7]) پھر ان کی صلاحیتیں ناول نگاری کے میدان میں چمکنے لگی اور وہ ملیالم ادب کے شاہکار ناول نگار بن گئے۔

'Thakazhi is the sort of writer who involves and matures slowly; his art is not of the lightning variety, coming with a flash, a minute's dazzle and is seen no more."([8])

[7]- سوانح عمری- تکشی- ص-44

[8] Ayyappa paicker-indian literature-155

ملیالم ادب میں 39 ناولوں اور بیس سے زیادہ افسانوی مجموعہ انہوں نے شائع کئے۔ان کے علاوہ ڈراما، سفر نامہ، اور سوانح عمری بھی شائع کی۔ان 39 ناولوں میں ان کی تین ناولیں بہت اہم ہیں بہ اعتبار زمانہ رنڈیڑنگڑی (دوسیر دھان)، چمین (جھینگا)، اور کائر (رسیَ)، ہیں۔ان تین ناولوں میں 'چمین' اور 'کائر' بہت مشہور ناولیں ہیں۔ان دونوں ناولوں کو ملیالم ادب میں ہی نہیں بلکہ عالمی ادب میں بھی اونچا مقام حاصل ہے۔ 1957 میں کیندر ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ ملنے کے بعد ناول "جھینگا" سب سے پہلے ہندی زبان میں ترجمہ ہوا جسے کیندر ساہتیہ اکاڈمی نے شائع کیا۔1962 میں ڈاکٹر وی-کے-نارائن نے جھینگا ناول کا انگریزی میں ترجمہ اسی نام سے کیا۔اور جھینگا کے ترجمہ کے ذریعہ غیر ملکوں میں بھی وہ مشہور ہو گئے۔دراصل ناول "جھینگا" نے ملیالی ادب کو ایک نیا موڑ عطا کیا۔اسی لئے تکشی کو صرف ملیالم کے ادیبوں میں ہی نہیں بلکہ ہندوستان کے نامور ناول نگاروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ڈاکٹر آر وشواناتھن نے اپنے مضمون میں لکھا ہے "ملیالم کے نامور شاعر چنگمپویا کی مشہور و معروف نظموں کا مجموعہ 'رمانن' کے بعد ملیالی لوگوں نے جس تصنیف کو اپنی چھاتی سے لگا رکھا ہے۔وہ ہے "جھینگا"۔ ([9])

تکشی کے شاہکار ناول 'کائر' کو گیان پیٹھ ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اس جلسہ میں مشہور مصنف 'اکٹوویاباز' نے تکشی کے بارے میں اس طرح تعارف پیش کیا کہ 1957 میں جھینگا ناول کی اشاعت سے ہی تکشی کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہو گئی تھی۔ ([10])

کیرالا کے ترجمہ نگاروں نے تکشی کے اکثر ناولوں کا ترجمہ دوسری زبانوں میں کیا ہے۔تکشی نے ملیالم ادب کو ایک نیا موڑ عطا کیا ہے۔ناول کائر تکشی کا ایک شاہکار ناول ہے۔اور

9-ملیالم بھاشا اور تعلیم-ڈاکٹر آر-وشواناتھن-89

10-اینٹے اور مکل-ڈاکٹر آرزو-ص-16

یہ ایک خاص دور کا احساس کراتا ہے۔ اس میں مٹی سے کسانوں کی محبت، زمینداروں کا لالچ چھوٹے اور بڑے کرداروں کے ذریعہ انسانی زندگی کے مختلف روپ پیش کئے گئے ہیں۔

کائر ناول تکشی کا ایک شاہکار ناول ہیں۔ اس ناول لکھنے کا مقصد اور اس کے پس منظر کے بارے میں خود تکشی نے اظہار خیال کیا ہے کہ 'پنم پلی گوویندن' جو اس زمانے کے بڑے سیاسی لیڈر رتھے۔ ایک دن مجھ سے مل کر کیا کہ "آپ کو ایک ایسا ناول لکھنا چاہئے جس میں "نظام حکومت کی پستی اور ابتری کا بیان ہوئی۔ اس طرح کا ناول لکھنا صرف آپ ہی کے بس کی بات ہے"۔ (11) پنم پلی کے خواہش میں کی وجہ سے تکشی نے یہ ناول لکھا ہے۔

کائر ایک خاص دور کا احساس ہے۔ اس میں مٹی سے کسان کا دلی لگاؤ اور مٹی کی پیاس کی کہانی سے شروع کر کے ایک تبدیل ہوتی ہوئی کہانیوں کے شکل میں ناول کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں ہیرو اور ہیروئن سماج خود ہے۔ اس ناول میں ڈھائی سو سال پر محیط اس علاقے میں جینے اور مرے ہوئے انسانوں کی زندگی اس میں بیان کی گئی ہے۔ اس میں دو صدی کی کیرالا کی بدلتی ہوئی اجتماعی زندگی کو پیش کیا گیا ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ ناول "کائر" ایک خاص دور کا احساس ہے۔

ملیالم ادب کے نامور نقاد "پروفیسر تراگن" کے خیال میں تکشی کے ناول "کائر" کو ایک سماجی دستاویز کی حیثیت میں دیکھنا بہتر ہے۔ واقعات کو اس کے اصل روپ میں بیان کرنا ناول نگار کا مقصد تھا۔ اس میں انھوں نے کامیابی ہوئی۔ (12)

---

[11]- دیباچہ کائر ناول- تکشی- ص-5

[12]- مضامین- تراگن- بھاشا بھوشنی- اپریل 1980

تکشی کو بہت سارے ایوارڈز ملے ہیں۔ناول چمین (جھینگا) کو 1957 میں کیندر ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ ملا۔اس جلسہ میں تکشی کو اسی طرح متعارف کیا گیا ہے۔

"By tradition a farmer, by profession a lawyer and by choice a literary man."(13)

کیر الا ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ، سویت لانڈ ایوارڈ، ویلار ایوارڈ، گیان پیٹھ اور پدم بھوشن انعام، کیر الا یونیورسٹی اور مہاتما گاندی یونیورسٹی کی طرف سے ڈی۔لیٹ کی اعزازی ڈگری، ولتول ایوارڈ وغیرہ نے اس فنکار کی ادبی عظمت میں اضافہ کیا ہے۔ ایپہ پنی کر کہتے ہیں؛

"In his best stories, one can almost hear the sound of breathing as if it were orally told.His imagination is down to earth, and his grand theme was the earth, mens attachment to the earth(.14)"

تکشی اپنے آپ کو کوٹاناڈ کے کسان مانتے ہیں اور انہوں نے کوٹاناڈ کی ادبی عظمت میں اضافہ کیا۔وہ ایک کسان طبقہ سے وابسطہ تھے۔اور وہاں کے چھوٹے بڑے اور سادہ حصہ کسانوں کو اپنے قلم کا موضوع بنایا۔تکشی نے گرسنگی کی کہانیاں زیادہ لکھی ہیں۔ملیالم کے ایک نقاد "ویلانی ارجن" نے ہفتہ وار رسالہ "کلاکومتی " میں اپنا خیال اس طرح پیش کیا کہ

13-سوانح عمری تکشی-تکشی-ص400

[14]Indian literature-AB-sai prasad-p 36

"ہندوستانی ادب میں تکشی کا مقابلہ صرف اردو میں پریم چند اور بنگالی میں "تاراشنکر بانرجی" سے ہی کیا جاسکتا ہے۔([15])

تکشی کی تحریر غریبوں کے مسائل اور ان کے دکھ درد کا حقیقی بیانیہ ہے۔ ذات پات سے پرے کیرالا سماج کی طرز ہائے زیست، انسانی دوستی، دیگر اقوام اور زندگی سے متعلق بصیرت وغیرہ کی سچی تصویر تکشی کی تحریروں میں پائی جاتی ہے۔ پلایا، تکوون، توٹی وغیرہ جیسے نچلے ذات کے لوگوں کی زندگی کی جد وجہد اور سامراجیت سے ٹکرانے اور انہیں تہس نہس کر دینے کے طریقے تکشی کی تخلیقات میں شامل ہیں۔

10 اپریل 1993 کے دن ملیالم ادب کی یہ تاریخ ساز شخصیت دنیائے فانی سے کوچ کر گئی۔ ایم۔ ٹی واسودیون نایر کی زبان میں "کہانی کا برگد" زمین دوز ہو گیا۔ تکشی ملیالم کے عالمی ادب کے عظیم فنکار تھے۔

---

[15]۔ مضامین - آج تکشی ہندوستان کی عزت - کلا کومتی - 11 اگست 1975

پریم چند

پریم چند 1880 میں بنارس سے چار پانچ میل دور لمہی نام کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ان کا پورا نام دھنپت رائے رکھا گیا گھر میں انھیں 'نواب' کے نام سے پکارا جانے لگا۔ اور جو بڑا ہو کر ہندستانی ادب کی دنیا میں پہلے نواب رائے اور پھر پریم چند کے نام سے مشہور ہوا۔ ان کے والد کا نام منشی عجائب لال تھا۔ پانچ سال کی عمر میں لال پور گاؤں میں ایک مولوی صاحب کے یہاں ان کی اردو اور فارسی کی تعلیم کی ابتدائی ہوئی۔ پریم چند کی ابتدائی تعلیم باقائدہ اور مناسب طور پر نہ ہو سکی کیوں کہ پریم چند کے والد کا مختلف مقامات پر تبادلہ ہوتے رہتا تھا۔ دھنپت رائے کی عمر سات یا آٹھ سال کی تھی ان کے والد ان دنوں میں الہ آباد میں مقیم تھے۔ اور وہاں ایک بیماری کی وجہ سے نواب رائے کی ماں اسے خدا کو پیاری ہو گئیں۔ اوران کی وفات کے لگ بھگ ایک سال کے اندر منشی عجائب لال نے دوسری شادی کر لی۔ بچپن سے ہی دھنپت کو کہانی سننے کا شوق تھا۔ ان کی بوڑھی دادی رات کو پریوں اور شہزادوں کی کہانیاں سناتیں۔ جنہیں وہ بڑی شوق سے سنتے تھے۔

دھنپت رائے کے والد ڈاک خانے میں کلرک تھے۔ جب ان کا 'گورکھ پور' تبادلہ ہوا تو وہاں ایک مشن اسکول کی چھٹی جماعت میں داخل کر دیا گیا۔ فارسی، انگریزی، اور تاریخ سے پریم چند کو دلچسپی تھی۔ لیکن حساب میں کمزور تھے اور ہمیشہ اسی مضمون میں ناکام ہوتے تھے۔ انگریزی ناول اور اردو کہانیاں بہت شوق سے پڑھتے تھے۔ ان کے بعض دوستوں نے لکھا ہے کہ ڈکنز کے باز طویل ناولوں کے قصّے وہ بڑی خوبی سے بیان کرتے تھے۔

1896 میں جب دھنپت رائے کی عمر پندرہ سال تھی، ان کے والد نے ان کی مرضی کے بغیر ان کی شادی کر دی۔ بیوی ایک زمیندار کی بیٹی تھی لیکن جاہل اور بد صورت تھی۔ دھنپت رائے کو ان سے کبھی محبّت نہ ہو سکی یہی وجہ تھی کہ ان دونوں کے بیچ میں اکثر لڑائی اور جھگڑا ہوتا رہتا۔ چند سال کے بعد وہ ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔ 1897 میں پریم چند کے والد چل بسے اور گھر کی ذمہ داری دھنپت رائے کے سر پر آپڑی اسی وجہ سے وہ اس سال کا میٹرک کا امتحان نہ دے سکے۔ یہ امتحان انہوں نے اگلے سال 1899 کے اوائل میں دیا۔ پڑھائی کے ساتھ ساتھ دھنپت رائے نے ٹیوشن بھی کیا کرتے تھے۔ دھنپت رائے کا ارادہ اعلی تعلیم حاصل کر کے وکیل بننے اور زندگی میں ایک بڑا مقام حاصل کرنے کا تھا۔ لیکن یہ خیال خواب بن کر رہ گیا۔

1899 میں میٹرک پاس کرنے کے بعد وہ پندرہ روپے ماہانہ پر ایک اسکول میں مدرس ہو گئے۔ کچھ عرصہ بعد انھیں چنار گڑھ کے ایک مشنری اسکول میں اسسٹنٹ ماسٹر کی معلّمی اٹھارہ روپئے ماہوار پہ مل گئی۔ یہاں کچھ مہینے خدمات انجام دینے کے بعد ایک سرکاری اسکول میں بیس روپئے کے ماہوار پر ان کا تقرر عمل میں آیا۔ 1904 میں وہ ٹریننگ کے لئے الہ آباد کے ایک کالج میں داخل ہو گئے۔ یہاں پہنچ کر انہیں کتابیں لکھنے کا شوق ہوا۔ اور بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں ایک نئے ادیب نے جنم کیا جو دھنپت رائے اور نواب رائے کے ناموں سے لکھنا شروع کیا۔ 1908 میں ان کے افسانوی کا پہلا مجموعہ سوزِ وطن شائع ہوا حکومت وقت نے کسی وجہ سے اسے ضبط کر لیا۔ نواب رائے نے کچھ عرصہ بعد اپنا قلمی نام پریم چند رکھ لیا اور دھنپت رائے اور نواب رائے کا ذکر بعد کبھی انہیں کسی تخلیق پر نہیں کیا۔

1905 میں ان کا پہلا ناول "اسرار معابد" بنارس کے ایک غیر معروف ہفتہ وار رسالے 'آواز حلق' میں شائع ہوا۔ یہ نواب رائے کے نام سے شائع ہوا تھا۔ یہ ناول آریہ سماج

کی معاشرتی، اصلاحی اور احلاقی تحریک سے متاثر ہو کر لکھا گیا تھا۔ پرتاب گڑھ آنے کے بعد نواب رائے کی ملاقات اردو کے مشہور رسالے "زمانہ" کے ایڈیٹر دیانرائن نگم سے ہوئی اور آہستہ آہستہ ان کی گہری دوستی ہو گئی۔ اور وہ پابندی کے ساتھ "زمانہ" میں لکھنا شروع کیا۔

1906 میں پریم چند کا ناول "ہم خرماو، ہم ثواب" لکھنؤ سے شائع ہوا۔ اور 1907 میں پریم چند نے ہندی میں اسکا ترجمہ کر کے الہ آباد سے شائع کیا۔ یہ دھنپت رائے کی جوانی کا زمانہ تھا۔ وہ تندرست اور خوبصورت تھے۔ اسی زمانے میں کئی سال تک ایک لڑکی سے انہوں نے عشق بھی کیا۔ لیکن کسی وجہ سے اس سے شادی نہیں ہو سکی۔ تب انہوں نے شیورانی دیوی سے شادی کر لی۔ جس سے ان کے تین بچے پیدا ہوئے۔

1908 کے "زمانہ" کے شمارہ میں ان کا پہلا افسانہ "عشق دنیااور حب وطن " نام سے شائع ہوا۔ کچھ دصہ بعد ان کہانیوں اس کے ساتھ چار کہانیاں مزید شامل کر کے سوزوطن کے نام سے ایک چھوٹی سی کتاب شائع کی۔ پریم چند کے نام سے ان کی پہلی کہانی 'بڑے گھر کی بیٹی رسالہ زمانہ میں شائع ہوئی یہ کہانی بہت مشہور اور مقبول ہوئی۔ 1915 تک پریم چند صرف اردو میں ناول اور کہانیاں لکھا کرتے تھے اس سال انہوں نے ہندی میں لکھنے کی مشق کر کے ہندی میں لکھنا شروع کیا۔ 1908 میں جب ان کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ "سوز وطن" شائع ہوا تو سرکار نے اسے ضبط کر کے جلا دیا۔ اس لئے کہ اس میں وطن پرستی اور قومی بیداری کا کھلا پیغام تھا۔

1920 تک پریم چند ہندی اور اردو کے ادیب کی حیثیت سے سارے ملک میں مشہور ہو چکے تھے۔ ان کے ناول اور افسانے شمالی ہندوستان میں بہت پسند کیے جاتے تھے۔ مہوبا کے قیام کے دوران پریم چند نے دیہاتیوں اور زمینداروں کی زندگی کو اپنے ناول کا موضوع بنایا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ملک میں آزادی کی تحریک زوروں پر تھی۔ کانگریس نے گاندھی جی کی رہنمائی میں ترک مولات اعلان کر دیا تھا۔ مہاتما گاندھی کی رہنمائی میں عدم تعاون اور ستیہ گرہ کی تحریک کامیابی سے چل رہی تھی۔ ہزاروں ہندوستانی سرکاری ملازمتوں سے استعفا دے رہے تھے۔ پریم چند نے بھی 16 فروری 1921 کو استعفادے دیا۔

اس کے بعد پریم چند نے زیادہ آزادی اور بے باکی کے ساتھ لکھنا شروع کیا۔ وہ لکھنؤ کے ایک مشہور ہندی رسالے 'مادھوری' کے ایڈیٹر بھی بن گئے۔ کچھ دنوں تک پریس میں کام کرنے کے بعد بنارس واپس چلے آئے۔ 1923 میں پریم چند نے خود بنارس میں ایک پریس قائم کر دیا۔ اور اس پریس کا سرسوتی نام رکھا۔ یہ پریس پریم چند کا ایک خواب تھا۔ اور اس پریس کو کامیاب بنانے کے لئے پریم چند نے دن رات محنت کی۔ اس دوران انہوں نے اپنا ماہ نامہ 'ہنس' بھی اپنے پریس سے مارچ 1930 میں جاری کیا۔ اور اس اس کے ساتھ ہی کچھ دنوں کے بعد انہوں نے ایک دوسرا ہفتہ وار "جاگرن" نکالا۔ یہ دونوں ہفتہ وار ہندوستان کی ادب کی بڑی خدمات کی۔ جس نے عوام کی آواز کو اپنی آواز بنا کر ملک کی آزدی کی تحریک کو آگے بڑھایا۔

پریم چند کی گھریلو زندگی بڑی سادہ تھی۔ وہ مذہب، ذات پات اور رسم و رواج کو زیادہ نہیں مانتے تھے۔ جب ان کی لڑکی کملا کی شادی ہوئی تو انہوں نے ایک ہندو رسم "کنیادان" ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ اس پر بہت جھگڑا ہوا، مگر وہ نہ مانے۔ اپنے بچوں کو اپنا دوست سمجھتے تھے اور اکثر خود بھی بچہ بن کر ان کے کھیلوں میں حصّہ لیتے تھے۔ ان کے دوست اور رشتے دار اکثر ان سے روپیہ یا ان کے کپڑے وغیرہ لے جاتے اور کبھی واپس نہ کرتے۔ اس پر ان کی بیوی ان سے لڑتیں جھگڑتیں، لیکن وہ باز نہ آتے۔ کبھی کبھار دوستوں کی محفل میں شراب بھی پی لیتے۔

ان کا رہن سہن اور لباس بہت سادہ تھا۔ انہوں نے اپنی بیوی شورانی کو بھی لکھنے پڑھنے پر اکسایا، چنانچہ ان کی کہانیوں کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے بڑے لڑکے شری پت رائے ایک مصور ہیں۔ انہوں نے ایک مسلمان لڑکی زہرہ سے شادی کی۔ چھوٹا لڑکا امرت رائے ہندی کا مشہور ادیب ہے۔

1934 میں پریم چند کو "اجنتا سینی ٹون فلم کمپنی" نے نو ہزار روپے سالانہ تنخواہ پر بمبئی بلایا۔ بمبئی پہنچ کر انہوں نے کئی فلمی کہانیاں لکھیں۔ انہوں نے پہلی فلمی کہانی "میل مزدور" لکھی۔ لیکن یہاں کی زندگی انہیں راس نہ آئی۔ ڈائریکٹر اور پروڈیوسر سستی عشقیہ کہانیاں چاہتے تھے اور پریم چند کی شہرت سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ اس کے لئے وہ تیار نہ ہوئے اور ایک سال بعد بنارس واپس آ گئے۔ کام کی کثرت اور کھانے پینے میں بے احتیاطی کی وجہ سے ان کی صحت خراب ہو گئی۔ پیٹ اور جگر کی تکلیف بڑھ گئی۔ آخر کار 8-اکتوبر 1936 کی صبح کا سورج نکلنے پر اردو اور ہندی ادب کا یہ جادوگر ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔

پریم چند اس صدی کے چند ہندوستانی ادیبوں میں سے ایک اہم اور مشہور فکشن نگار ہیں۔ انہوں نے اردو اور ہندی زبان میں مشرقی معیاروں کو سامنے رکھ کر کئی اچھے ناول اور افسانے لکھے۔ ہندوستانی عوام کے دکھ درد کو انہوں نے اپنا دکھ درد سمجھا اور پہلی بار اردو اور ہندی میں کسانوں، مزدوروں اور متوسط طبقے کی زندگی کو ادب کا موضوع بنایا۔ آخری عمر میں وہ ترقی پسند تحریک سے بھی متاثر ہوئے۔ اور کسانوں کی خوش حالی کے نئے منصوبے بناتے رہے۔ وہ کسانوں کو ان کی زمین کا مالک بنا چاہتے تھے اور گاؤں والوں کی زندگی کو بہتر بنانے کی کوشش ہمیشہ کرتے تھے۔

پریم چند اپنی تخلیقات اور فن کی بنا پر سارے ملک میں جانے پہنچانے جانے لگے تھے یہی وجہ ہے کہ ملک میں جہاں کہیں کوئی ادبی اجتماع ہوتا انھیں کو صدارت کے لئے بلایا جاتا تھا۔ترقی پسند مصنفین کے پہلی کانفرنس کے لیئے سجاد ظہیر نے پریم چند کو صدارت کی دعوت دی۔اور پریم چند کی صدارت اس کانفرنس کے موضوع اور مقاصد کے لحاظ سے بڑی معنی خیز اور اہمیت کی حامل تھی پروفیسر قمر رئیس لکھتے تھے۔

"پریم چند نے ترقی پسند مصنفین کے اس پہلے اجتماع میں جو خطبہ صدارت پڑھا وہ اپنی جامعیت اور اہمیت کے لحاظ سے ااس تحریک کا منشور سمجھا جاتا ہیں۔اس میں انہوں نے پہلی بار ادب اور سماج ،ادب اور سیاست،ادب اور جمالیات جیسے اہم مسائل پر عالمانہ مدلل اور مؤثر اسلوب میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔اور ادب کی غایت اور اس کے سماجی مقاصد کی حدیں متعین کیں۔"

ان کے اردو ہندی کہانیوں کی تعداد 300 سے زیادہ ہے۔ان میں اردو کی کہانیاں 200 سے زیادہ ہے۔"میرے بہترین افسانے" کے دیباچہ میں پریم چند نے 300 تعداد لکھی ہے۔فردوس خیال 'وفا کی دیوی 'نجات 'پریم پچیسی 'جیل۔کفن وغیرہ ان کے مختلف افسانوں کے مجموعے ہیں۔گؤدان 'بازار حسن 'نرملا 'میدان عمل 'منگل سوتر وغیرہ ان کے ناول ہیں۔ ناول اور افسانوں کے علاوہ ڈرامے بھی لکھے۔'روحانی شادی 'اور' پریم کا بھیدی' ''کربلا'' ان کے مشہور ڈرامے ہیں۔ڈراما "کربلا" ہندی اور اردو کا تاریخی ڈرامہ ہے۔انہوں نے کئی مغربی شاہکاروں کے کہانیاں اردو اور ہندی میں ترجمے بھی کیا۔لیکن افسانہ اور ناول میں انہیں سب سے زیادہ کامیابی حاصل ہوئی۔

پریم چند اصل میں اردو کے ادیب تھے۔ یہ حقیقت کسی سے پوشیدہ نہیں اور اس میں کسی کو کوئی شک نہیں ہے۔ ہندی میں انہوں نے سب سے پہلے 1914 میں مختصر افسانے لکھنے شروع کئے۔ پریم چند کا پہلا افسانہ "دنیا کا سب سے انمول رتن " ہے۔ پریم چند کا پہلا ناول "اسرار معابد" ہے جو اکتوبر 1903 میں شائع ہوا۔ پریم چند نے ناولوں اور کہانیوں کا مواد اپنے آس پاس کی زندگی سے لیا۔ اسی وجہ سے پریم چند نے ناول نگاری اور افسانہ نگاری میں اپنا راستہ بالکل الگ بنایا۔ ناول "اسرار معابد" کا موضوع نام نہاد، مذہبی رہنماؤں اور نچلے طبقے کے لوگوں کی زندگی ہے۔ اس کے بعد پریم چند کا مشہور ناول "بازار حسن" ہے جسے پریم چند نے 1916 میں لکھنا شروع کیا اور 1917 میں شائع کیا۔ ہندی میں اس ناول کو 'سیوا سدن' نام سے پریم چند نے لکھا۔ اس کے بعد 'نرملا' پریم چند کا ایک اہم ناول ہے جسے 1921 میں لکھنا شروع کیا اور 1923 میں ختم اور شائع کیا۔ اور اس ناول میں پریم چند نے سماج کے برائیوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی۔ اس ناول میں پریم چند سماجی زندگی کے مسائل کو اہمیت دیتے ہے۔ "چوگانِ ہستی" پریم چند کا ایک اہم اور ممتاز ناول ہیں۔ عبد الماجد دریابادی نے چوگان ہستی کو پریم چند کا بہت اچھا اور شاہکار ناول کہا ہے، جو 1924 میں لکھا گیا اور 1927 میں اردو میں شائع ہوا۔ اس ناول میں پریم چند بنارس کے ایک گاؤں اور اس گاؤں کے لوگوں کی زندگی بیان کی ہے۔ اس کے بعد پریم چند نے "میدانِ عمل" مکمل کیا۔ اس ناول کا موضوع ہندوستان کی جدوجہد آزادی اور سماجی زندگی کے مسائل ہیں۔ یہ ناول 1932 میں اپنے ہی پریس سے شائع کیا– یہ پریم چند کا مشہور ناول ہے۔ اس کے بعد ناول "گؤدان " پریم چند کا آخری شاہکار ناول ہے۔ پریم چند نے اس ناول کا موضوع کسان کی زندگی قرار دیا اور کسان کی سماجی اور معاشی زندگی کے تمام پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ پہلے یہ ناول ہندی میں لکھا۔ 1936

میں یہ ناول اپنے پریس سے شائع کیا۔ پریم چند کی وفات کے تقریباً ایک سال بعد اردو میں یہ ناول شائع ہوا۔ یہ پریم چند کا آخری اور شاہکار ناول ہے۔

پریم چند کے ناولوں میں ہمیشہ ایک واضح موضوع ملتا ہے ۔جو ان کے اجتماعی اور انفرادی تجربات کا نچوڑ ہوتا ہے۔اجتماعی زندگی کی یہ تبدیلیاں چونکہ پریم چند کے موضوعات کو بدلتی رہی ہیں اس لئے پریم چند کے یہاں جو موضوعات کا تنوع ملتا ہے۔وہ اردو کے کسی اور ناول نگار کے یہاں نہیں ملتا اسی وجہ سے پریم چند کا دائرہ عمل اردو کے دوسرے ناول نگاروں سے بہت زیادہ وسیع ہے۔

بابِ دوم

ناول کی روایت

ناول کی روایت

ادب کا آغاز کس طرح ہوا؟ اس سوال کی گہرائی میں ڈوبنے کے بعد ہی ادب کی ایک مخصوص صنف ناول کی ابتدا اور آغاز کا پتہ لگایا جا سکتا ہے۔ ناول زندگی کے حقائق کی سچی تصویر کشی کا نام ہے۔ اس میں ادیب زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اپنی فنی مہارت کی مدد سے پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اپنی زبان و بیان کی طاقت سے اس میں جاذبیت اور دلکشی بھرتا ہے۔ انسان کی زندگی، سماجی و معاشی حالات اور ان کے مسائل وغیرہ کا بیان ناول نگار اپنی ناولوں میں پیش کرتا ہے۔ ہندوستان میں ناول نگاری کا آغاز انگریزوں کی آمد کے بعد ہی ہوا۔ یہ صنف اردو، ملیالم یا ہندوستان کی دیگر زبانوں میں انگریزی کے زیرِ اثر ہی وجود میں آئی۔ اس باب میں ملیالم اور اردو ناول نگاری کی روایت کا بیان پیش کیا جا رہا ہے۔

ملیالم ناول کی روایت: تکشی کا دور اور اس سے قبل

ملیالم ناول کی تاریخ کچھ 130 سال پرانی ہے۔ اردو کی طرح ہی ملیالم میں بھی ناول نگاری کی ابتدا انیسویں صدی میں ہوئی۔ انگریزی ادب کے زیرِ اثر ناول نگاری کی ابتدا ہونے کی وجہ سے ابتدائی ملیالم ناولوں میں دیگر ہندوستانی زبانوں کے تراجم کی کثرت بھی پائی جاتی ہے۔ ملیالم ادب کا پہلا ناول "کندلتا" کو مانا جاتا ہے، جسے اپّو نیڈو نگاڑی نے سن 1887 میں تصنیف کیا تھا۔ یہ دور ملیالم ادب میں بھی شعر و شاعری کا دور کہا جاتا تھا جہاں لوگ ادب کو صرف شعر و شاعری تک ہی محدود رکھتے تھے۔ "کندلتا" کے ذریعے اپّو نیڈو نگاڑی نے ملیالم ادب میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا جس کے ذریعے نثری ادب کو بھی ملیالم ادب میں جگہ ملنے کی امید پیدا ہو گئی۔

حالانکہ "کندلتا" ملیالم ادب کا پہلا ناول ہے لیکن 1889 پر منظرِ عام پر آنے والے چنتو مینون کا ناول "اندولیکھا" کو ملیالم کا پہلا اہم ناول قرار دیا جاتا ہے۔ چنتو مینون کے ناول "اندولیکھا" کی اشاعت کے بعد ہی ملیالم ادبی حلقوں میں ناول کا باقاعدہ تعارف ہوا۔ فنی اعتبار سے "اندولیکھا" ملیالم ادب کا ایک شاہکار ناول ہے۔ اس ناول کی زبان، اندازِ بیان، سماجی حقائق وغیرہ کی حقیقی عکاسی کی وجہ سے ہی آج بھی قارئین اسے بڑے شوق سے پڑھتے ہیں۔

چنتو مینون پیشے سے جج تھے اس لئے انگریزی زبان پر دسترس رکھتے تھے۔ انہیں انگریزی ادب کی شد بد بھی تھی اس لئے انگریزی ادب سے اثر قبول کرنا ان کے حق میں ایک فطری عمل تھا۔ "اندو لیکھا" میں انہوں نے اس دور کے معاشرے کی سماجی حالات کی بہترین عکاسی کی ہے۔ قدیم طبقاتی نظام، ذات پات، تہذیب کا زوال انگریزی تعلیم حاصل کرنے والی نئ نسل کی آزاد خیالی ناول کے اہم کڑیوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ملیالم ادب کے ابتدائی دور کا دوسرا بڑا نام سی-وی-رامن پلائی ہے۔ تروتانکور راج کی تہذیب و ثقافت اور وہاں کے نقوش کی عکاسی ان کے ناولوں میں پائی جاتی ہے۔ ان کے ناول "مارتانڈ ورما" (1891) اور "دھرمہ راجا" (1911) وغیرہ نے ملیالم ادب کے ناولوں میں اضافے کا کام انجام دیا۔ ان کا انگریزی ادیب "سر والٹر اسکاٹ" سے موازنہ کیا جاتا ہے۔ انہوں نے اپنے ناولوں کے ذریعے انگریز حکومت کے خلاف آواز اٹھائی۔ انہوں نے تاریخی ناولوں کے ساتھ ساتھ جاسوسی ناولیں بھی لکھیں۔

اس کے بعد کچھ عرصے تک ملیالم ناول کی دنیا میں کوئی ہلچل نہیں دکھائی دی۔ اس دور میں صرف ایک قابلِ ذکر تصنیف کا بیان ملتا ہے۔ یہ ایم-بی نمبوتری پاڈ کے ناول "اپّنٹے مکل" (باپ کی بیٹی) میں نمبوتری طبقے کی بالادستی اور استحصال کا ذکر ملتا ہے۔ اس ناول کے ذریعے ناول نگار نے بین الزمرہ شادی، تعددِ ازواج کی ممانعت، تعلیمِ نسواں جیسے اہم مسائل پر آواز اُٹھانے کی کوشش کی ہے۔ اس دور کو ملیالم ناولوں کا تشکیلی دور کہا جاسکتا ہے۔

چنتو مینون کے زمانے تک ملیالم ادیب انگریزی ادب سے نابلد تھے لیکن اس کے بعد اس صورتِ حال میں تبدیلی آگئی۔ ناول سماج کے مختلف پہلوؤں اور مذہبی افکار پر اثر انداز

ہونے لگا۔ ناول اپنے دور کے سماجی، معاشی اور سیاسی حالات کی حقیقی تصویر کشی کرنے لگا۔ بیسیوں صدی کے آغاز کے بعد نئے نئے رجحانات اور نئے نئے تصورِ فکر منظرِ عام پر آنے لگے۔ سماج میں مختلف قسم کی تبدیلیاں بہت تیزی سے پیدا ہونے لگی۔ ڈارون، مارکس، فرائڈ وغیرہ کے پیش کئے گئے فلاسفہ نے انسان اور سماج کو کئی ایسے سوالات کے گھیرے میں لا کھڑا کر دیا جو ان کے وجود پر سوالیہ نشان بنا ہوا تھا۔ ان سوالوں کے جواب کی تلاش میں کئی دانشوروں نے اپنی نئی تھیوریاں بنائی اپنے انسان کا زاویۂ تخیل نئی راہوں کی طرف گامزن ہو گیا جس کی وجہ سے نئے نئے ابعاد کھلنے لگے اور نئے فکری گوشوں کا باب کھلنے لگا۔ 1930 کے بعد کے دور میں ملیالم ادب میں تراجم کی بھرمار ہوئی۔ انگریزی اور دیگر زبانوں سے کئی فن پارے ملیالم ادب میں متعارف ہوئے۔ مطالعے کی وسعت اور عالمی ادب کے مطالعے اور اس کے اثرات کی وجہ سے ملیالم ادب میں جدید ادب کا آغاز ہوا۔ روس کے انقلاب اور اشتراکیت کی لہر نے کیرالا کے ادیبوں کے ذہن میں پھیلے دھول کو صاف کیا اور انہیں بہت سے تعصبات سے آزاد کیا۔ اشتراکی ذہن اور مغربی فن پاروں کی فنی خصوصیت کو ملیالم ادیبوں نے اپنے اندر سمو لیا اور اسی طرح ملیالم ادب کے سنہرے دور کا آغاز ہوا۔

ملیالم ادب کے سنہرے دور کے ممتاز ترین ناول نگار تکشی، کیشو دیو اور وکیم محمد بشیر ہیں۔ ان کے علاوہ دو ایسے بھی نام ہیں جنہوں نے ان کی روایت کو ملیالم ادب میں اور آگے تک بڑھایا۔ وہ دو نام ہیں اروب اور ایس-کے پوٹے کاڈ۔ ان پانچوں ناول نگاروں کی اپنی منفرد اور مختص عظمت ہیں۔ تکشی کے ناولوں میں جہاں ایک زمانے کا لہو اور اس کی حقیقتیں دوڑتی ہیں تو کیشو دیو کی تخلیقات میں مذہبی جوش کے شعلوں کی لپک دکھائی دیتی ہے۔ بشیر کی تصنیفات سے

جہاں علم کا نور پھوٹتا ہوا نظر آتا ہے۔ اروب کی تخلیقات میں جہاں ضبطِ نفس کی توانائی کا اظہار ہوتا ہے وہیں پوٹے کاڈ کا قلم انسانی جذبات کی ترجمانی کرتا ہے۔

تکشی شیو شنکر پلائی کے ہم عصر ناول نگار

1) کیشو دیو (1905–1983)

ملیالم ادب کے ابتدائی دور میں سماجی مسائل کی عکاسی تو بھرپور ہوتی رہی لیکن خواتین کی آزادی، ان کے مسائل، بین ذات شادیاں، تعلیم وغیرہ جیسے موضوعات بعد کے دور میں ہی لکھے جانے لگے۔ کیشو دیو کی تخلیقات نے ملیالم ادب میں ان نئے مسائل کا باب کھولنے میں اہم رول ادا کیا۔ ملیالم ادب کے سنہرے دور میں تکشی شنکر پلائی کے ہم پلہ اگر کسی ناول نگار کو رکھا جا سکتا ہے تو وہ صرف کیشو دیو ہیں۔ ان کی تخلیقات کا مرکزی خیال انسانی آزادی تھا۔ کیشو دیو کے ناول سماج کے نچلے طبقے کے لوگوں کی زندگی، ان کے تجربات وغیرہ کو مدِ نظر رکھتے ہوئے لکھے گئے ہیں۔ ان کا مشہور ناول "اوڈیل ننو" (گٹر سے) میں غریب گھرانے سے تعلق رکھنے والے "پپّو" کی کہانی ہے جو اپنی محنت اور لگن سے اپنے پیروں پر کھڑے ہوتا ہے اور آزادی نفس حاصل کرتا ہے۔ زمینداروں کے گھر کام کرنے والے والدین کے ساتھ رہنے کے باوجود "پپّو" بچپن سے ہی باعزم اور باہمت رہتا تھا۔ اسے بچپن ہی سے زمینداروں کے تحت زندگی گزارنے میں کوفت محسوس ہوتی تھی۔ اسی لئے وہ زمینداروں کی بستی اور ان کا اسکول چھوڑ شہر کی طرف نکل پڑا جہاں اس نے پہلے مزدوری کی اور بعد میں خود اپنی کمائی سے ایک رکشا خرید لیا۔ شہر کی بھاگ دوڑ بھری زندگی میں روزی روٹی کمانے کے دُھن میں جی رہے

"پپّو" کی زندگی میں ایک دن اچانک "کلیّانی" اور اس کی بیٹی "لکشمی" آجاتے ہیں۔ دراصل لکشمی پپّو کے رکشے سے ٹکرا کر ایک گٹر میں گر جاتی ہے جس کی وجہ سے اس کا سارا کھانا برباد ہو جاتا ہے۔ پپّو کو اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے اور ان دونوں ماں بیٹی کی حالت دیکھ وہ ان کی ذمے داری لیتا ہے۔ وہ لکشمی کو اسکول میں داخل کرواتا ہے اور اس کی تعلیم کا پورا خرچہ اپنے ذمے لیتا ہے اس طرح ایک خاندان کی طرح وہ ایک ساتھ رہنے لگتے ہیں۔ لکشمی کی ضرورتوں کو پوری کرتے کرتے اس کی پوری عمر گزر جاتی ہے یہاں تک کہ اس میں کمزوری آجاتی ہے جس کی وجہ سے وہ رکشا چلانے سے قاصر ہو جاتا ہے۔ پھر بھی وہ آرام کی زندگی سے پرہیز کرتا ہے۔ اسے محنت کیے بغیر کھانا گوارا نہیں اس لئے لاچار ہونے کے باوجود وہ اپنی رکشا بیچ کر اور لوم میں کام کر کے لکشمی کی شادی کے لئے رقم جمع کرتا ہے اور اس کی شادی ایک اچھے گھرانے میں کروانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ کیشو دیو کے اس کردار "پپّو" کے ذریعے قاری کو ظلم و استحصال کے خلاف آواز اٹھانے، اپنے پیروں میں کھڑے ہونے، محنت و لگن کی زندگی گزارنے اور اپنی ذمے داریوں کو صلے کی پرواہ کیے بغیر پوری کرنے کی ترغیب ملتی ہے۔ ناول "اوڈیل نِنو" کو مزدور طبقے کی کہانی بھی کہا جا سکتا ہے۔

1944 میں منظرِ عام پر آنے والا یہ ناول ان کی مشہور تخلیق ہے۔ اس سے پہلے کے ناولوں سے ہٹ کر اس ناول میں مرکزی کردار کو ایک نئے انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ جس کی وجہ یہ ناول ملیالم ادب میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سے پہلے کے ناولوں میں سماج کے اعلیٰ طبقے کے لوگوں کو ہی مرکزی کردار کی حیثیت سے پیش کیا جاتا رہا تھا لیکن ناول نگار نے اپنے ناول میں سماج سے جڑے افراد کو اپنی کہانی کا مرکزی کردار بنانے کی جرأت کی، جو بہت مقبول بھی ہوئی اور قابلِ ستائش بھی اور اس طرح ملیالم ادب سماج اور عوام سے جڑ گئی

اور ادب میں ایک انسانی نقطۂ نظر کا آغاز ہوا۔ ان کے دیگر ناولوں میں نڈی (1945)، بھرانتالیم (1949)، اُلگّا (1951)، راوٗڈی (1958)، ایل کّار (1963)، آر کو وینڈی (1953)، کناّڈی (1965)، سوپنم (1967)، ادھکارم (1968)، نجونڈی یوڈے کتھا (1974)اور اینگوٹّ(1975)وغیرہ شامل ہیں۔

کیشو دیو کا ایک اور ناول "براندھالیم" (پاگل خانہ) تقسیمِ ہند، فرقہ وارانہ فسادات، مشترکہ تہذیب اور ہجرت کے مسائل کی عکاسی کرتا ہے۔ یہ ناول کیرالا کے مالدار مسلم گھرانے کے ارد گرد گھومتی ہے۔ یہ گھرانہ بڑا ہی دیندار ہے اور عمر کٹی(Ummer kutty) اس گھر کے سرپرست ہیں۔ عمر کٹی کے بڑے بیٹے رحیم کے گھر چھوڑ جانے کے غم سے اس کے ماں باپ کا انتقال ہو جاتا ہے اور ان کا چھوٹا بیٹا عبدو اس دنیا میں اکیلا رہ جاتا ہے۔ ناول کی کہانی اسی کردار "عبدو" کی زندگی کے اطراف گردش کرتی ہے۔ عبدو اپنے پڑوسی پاتما اور ان کی بیٹیوں جمیلہ اور تتا کے ساتھ زندگی گزارتا ہے۔ تقسیمِ ہند کے وقت عبدو ان تینوں کے ساتھ پاکستان ہجرت کرنے کے لئے نکل پڑتا ہے اور راستے میں فرقہ وارانہ فسادات کا نشانہ بن جاتا ہے۔ یہاں رحیم سے ان کی ملاقات ہوتی ہے جو انہیں ان فسادات سے بچانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

1945ء میں شائع شدہ کیشو دیو کا ناول "نڑی" (اداکارہ) ملیالم ناول کی ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ڈرامائی طرز میں لکھے گئے اس ناول کو ملیالم ڈرامے کا نقطۂ آغاز میں سمجھا جاتا ہے۔ اس ناول کے مرکزی کردار منصف کورٹ میں کلرکی کرنے والے گووندن پلائی، جانکی اماّ اور ان کی بڑی بیٹی مینا (میناکشی) ہیں۔ ناول کی کہانی مینا کے اطراف گردش کرتی

ہے جو ناٹک اور اس کے فن کی دلدادہ ہے اور اسی وجہ سے گھر چھوڑ کر نکل پڑتی ہے۔ مینا اور پوترن کو اپنی منزل میں درپیش مسائل، ذات پات، اونچ نیچ، سماجی ناانصافی وغیرہ اس ناول کے اہم نکات ہیں۔

ان کا اگلا ناول "راوڈی" (1958) ایک دلیر اور ہر دل عزیز کردار "پرمو" کی کہانی ہے۔ 1963 میں منظرِ عام پر آیا ناول "ایل کّار" (پڑوسی) دو بڑے خاندانوں کے بیچ ہونے والے آپسی جھگڑے اور ان کی تباہی کا قصہ بیان کرتا ہے۔ 1953 کے ناول "آر کو وینڈی" (کس کے لئے ؟) میں ناول نگار نے خاندان کو تباہی کی طرف لے جانے والے بڑے بوڑھوں کا قتل کر کے بھاگنے والے کیشون نامی لڑکے کی عجب داستان بیان کی گئی ہے۔ کیشو دیو کا ناول "کنّاڈی" (آئینہ) انقلابی ناول کہلاتا ہے۔

کیشو دیو کے نزدیک انسانیت پسند سماجی شخص ہی سب سے اہم ہے۔ ان کے کردار سماج کے دبے کچلے اور کمزور لوگ ہیں۔ ان کی مشقت بھری زندگی اور ہندوستان جیسے جمہوری ملک میں ہونے والے انقلابات، اعلیٰ طبقے اور امیروں کی من مانی ان کی کہانیوں کا محور ہے۔ ان کے ناولوں میں انقلابی افکار تو پائے جاتے ہیں لیکن وہ مارکسزم جیسے کسی نظریے سے وابستہ نہیں تھے۔ ان کے ناولوں کے کردار بے اصول اور استحصال کے خلاف لڑتے نظر آتے ہیں۔

2) ویکم محمد بشیر (1908 – 1994)

ملیالم ناولوں کو ایک نئی راہ پر لانے والے سب سے مشہور ادیب ویکم محمد بشیر ہیں۔ بشیر ایک ایسے ناول نگار ہیں جنھوں نے اپنے ناولوں کے ذریعے نئی فکری وسعت پیدا کر کے

ملیالم ادب میں اپنے لئے ایک امتیازی مقام پیدا کیا۔ انسانی زندگی کے نشیب و فراز کو بخوبی سمجھنے اور اپنی تخلیقات میں انہیں اجاگر کرنے میں ویکم محمد بشیر کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ اپنی زندگی کے کڑوے میٹھے تجربات کو اپنی ادبی تخلیقات اور کہانیوں میں ڈھالنے کے انوکھے فن کی وجہ سے ہی انہیں "تجربات کے تخلیق کار" کے نام سے موسوم کیا جانے لگا۔ ان کی کہانی ان کی اپنی زندگی، ان کے افرادِ خاندان اور ان کے گاؤں کے ارد گرد بسی ہوئی ہے۔ بشیر نے زندگی کے ہر سبق کا بخوبی مطالعہ کیا تھا۔ غریبی، بھوک مری، دکھ، حادثات، سیاسی سرگرمیاں، انقلابات، زندانی زندگی، مختلف مذاہب کی زندگی، ادبی زندگی، صوفیانہ زندگی، تنہائی وغیرہ کو انہوں نے خود اپنی زندگی میں محسوس کیا تھا اور یہی ان کی کہانیوں میں بھی پایا جاتا۔ ان کی کہانیوں سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ ادب ہی شخصیت کی تعمیر کرتا ہے۔

بشیر کی زندگی کے واقعات نے ان کی شخصیت کو بہت نکھارا ہے۔ وہ اپنے لڑکپن میں ہی جد و جہدِ آزادی کی بھاگ دوڑ میں لگ گئے اور نمک ستیہ اگرہ میں حصہ لیتے ہوئے انگریزوں کے ہاتھوں گرفتار بھی ہوئے۔ انہوں نے اپنی زندگی کے ایک دور میں ہندوستان کے مختلف جگہوں کا سفر بھی کیا۔ وہاں چھوٹے موٹے کام کر کے اپنا پیٹ پالا اور زندگی کے نئے تجربات سے آشنا ہوئے۔ ان کی زندگی میں ایک دور ایسا بھی آیا جب انہیں جنون کا دورا پڑا جس کی وجہ سے انہیں پاگل خانے میں بھی کچھ وقت گزارنا پڑا۔ اسی دور میں ان کا سب سے مشہور ناول "پاتمایوڈے آڈو" (فاطمہ کی بکری) ضبطِ تحریر میں آیا۔

ڈیوڈ ڈیچس کے بقول ناول باہمی تعلق رکھنے والے واقعات کی ایک لڑی کا نام ہے۔ اسی قول کی سب سے اچھی دلیل ہم بشیر کے بہت سے ناولوں میں دیکھ سکتے ہیں۔ ان ہی میں سے پاتمایوڈے آڈو (فاطمہ کی بکری)، اینڈے اپوپاکورو آنڈایرونو (دادا کا ہاتھی)، بالیاکالہ

سکھی (بچپن کی ساتھی)، پریم لکھنم (محبت نامہ)، پاوپیٹ ورڈے ویشیا (غریبوں کی طوائف)، موچیٹ کلکارنڈے مکل (جواری کی بیٹی)، وشو وکھیاتھ مایہ موک (عظیم ناک)، وڈھکلڈے سورگم (بے وقوفوں کی جنت) وغیرہ ناول ملیالم ادب میں ابھر کر سامنے آئے۔ بشیر نے اپنے ناول پاتما یڈے آڈو (فاطمہ کی بکری) میں اپنے گھر کے حالات اور اپنے خاندان کی زندگی کو بڑے پر درد انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کا ایک اور ناول موچیٹ کلکارنڈے مکل (جواری کی بیٹی) میں ایک عام مسلمان گھرانے کی زندگی کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ اس ناول کی کہانی ایک غریب، ان پڑھ مسلم گھرانے کی زندگی کے ارد گرد گھومتی ہے۔ اس ناول میں بشیر سماج میں پائے جانے والے توہم پرستی، اور رسم و رواج کے مٹانے میں تعلیم کی اہمیت کا سبق دیتے نظر آتے ہیں۔

بشیر کے ناولوں کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ بشیر ایک انقلابی قلم کار سے زیادہ ایک حقیقت نگار یا حقیقت جویا قلم کار تھے۔ ان کی تحریروں میں جہاں سماج کے پوشیدہ حقائق ملتے ہیں وہیں مزاح کا عنصر بھی پایا جاتا ہے۔ ان کی تحریروں کی خاصیت یہ ہے کہ ان میں مزاح اور انقلاب دونوں کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ خود ان کے بقول ناول "پاتما یوڈے آڈو" (فاطمہ کی بکری) جو کہ ایک مزاحیہ داستان ہیں، لکھتے وقت ان کے اندر آگ کے شعلے بھڑک رہے تھے گویا بشیر کے لئے تخلیقِ ادب آگ میں جھلسنے کا ذریعہ ہے۔

ان کا مشہور ناول "پاتما یوڈے آڈو" (فاطمہ کی بکری) کا اردو کے ساتھ ساتھ دیگر زبانوں میں بھی ترجمہ کیا جاچکا ہے۔ یہ ناول "پاتما" نامی ایک لڑکی کی کہانی ہے جو بچپن ہی سے جانوروں سے بے حد لگاؤ رکھتی ہے۔ یہ کہانی اندھے عقائد اور توہم پرستی کے ارد گرد گھومنے والے خاندان کی کہانی ہے۔ دیکھا جائے تو یہ کہانی خود بشیر کے خاندان کی ہی کہانی ہے لیکن بشیر

کی اسلوب نگارش یاطریقِ اظہار کی مہارت کے باعث یہ ہم سب کی کہانی بن جاتی ہے۔بشیر نے اس ناول میں ایک چھوٹے سے گاؤں کے گھر میں پوری کائنات کی وسعت پیدا کر دی۔

بشیر کا ایک اور مشہور ناول "بالیہ کالہ سکھی" (بچپن کی ساتھی) ہے جس کا بھی اردو کے ساتھ ساتھ دیگر زبانوں میں ترجمہ کیا جاچکا ہے۔ یہ کہانی ان کی فنی مہارت کی عمدہ مثال ہے۔ بشیر کے ناول بہت بڑے تو نہیں ہوتے لیکن ان کی معنویت اور ان کی زبان اسے اپنے آپ میں ایک منفرد مقام دلاتا ہے۔ "بالیہ کالہ سکھی" بظاہر ایک کشمکش سے بھری کہانی ہے لیکن اس کے باوجود اس میں انسانی مقدر اور اس کی زندگی کے نازک نکات پر بھی نظر ڈالی گئی ہے۔اس ناول کی زبان بہت شیریں ہے۔ان کے جملے بانسری کے دل سوز تان کی مٹھاس رکھتے ہیں۔اس کے ایک ایک لفظ میں گویا مندر میں بجتے ہوئے ناقوس کی آواز سنائی دیتی ہے۔

یہ ناول مجید اور سہرہ (زہرہ) کے محبت کی داستان ہے۔ مجید ایک مالدار گھرانے کا لڑکا ہے جب کہ سہرہ ایک غریب گھرانے کی۔ لڑکپن میں دونوں آپس میں محبت کرتے ہیں لیکن مجید اپنے باپ سے جھگڑ کر شہر کی طرف نکل جاتا ہے۔کئی برس بعد جب وہ اپنے گھر لوٹتا ہے تو اس کا گھرانہ اپنی قدیم شان و شوکت کھو چکا تھا اور سہرہ کی کہیں اور شادی ہو گئی۔ اس مایوسی کی حالت میں وہ پھر سہرہ سے ملتا ہے جو اپنی ناکامیاب شادی اور ظالم شوہر کو چھوڑ کہ اپنے گھر لوٹ آئی ہے۔ یہاں دونوں پھر ملتے ہیں لیکن گھر کی معاشی حالت کو سدھارنے مجید پھر سے اپنی ماں اور سہرہ کو اپنے گھر میں چھوڑ کر شہر کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔ اس مرتبہ وہ وہاں غربت کی زندگی گزارنے لگتا ہے یہاں تک کہ ایک حادثے میں اس کی ایک ٹانگ بھی بے کار ہو جاتی ہے۔ پھر بھی وہ سخت محنت کرتا ہے تاکہ وہ گھر لوٹ کر اپنی بچپن کی ساتھی کے ساتھ اپنی ساری زندگی گزار سکے۔ لیکن قدرت اس کی اس خواہش کو نہیں پورا کرتی۔ایک دن اسے

اپنی ماں کا خط ملتا ہے جس میں سہرہ کی بیماری کا ذکر ہوتا ہے اور پھر اس کی موت کی خبر اسے موصول ہوتی ہے۔

بشیر کا ناول "نٹو پاپپو کورانے ڈارنو" (میرے دادا کا ہاتھی تھا) سماج کے پیچیدہ مسائل کی گہرائی میں اترنے کی ان کی فکری توانائی کی ایک بہترین مثال ہے۔ بشیر کی بیشتر تخلیقات کیرالا کے مسلم معاشرے کی صورتِ حال کی عکاسی کرتی ہے۔ ناول "نٹو پاپپو کورانے ڈارنو" (میرے دادا کا ہاتھی تھا) میں انہوں نے اپنے معاشرے کو ایک عالمگیر حقیقت کے تجزیے کا وسیلہ بنایا ہے۔ اس ناول میں بشیر نے اپنے معاشرے میں کئی نسلوں سے موجود نسلی تعصب کا بھی ذکر کیا ہے۔ ناول میں ایک جگہ وہ لکھتے ہیں " دادا کے ہاتھی نے چھے آدمیوں کو مارا ہے۔ چھے کے چھے مہاوت کافر تھے۔ ایک بھی مسلمان کو اس ہاتھی نے نہیں مارا۔" یہ قصہ نثار احمد اور کنجی پاتما کی عشقیہ داستان کے ارد گرد بُنا گیا ہے۔ لیکن اس کا مرکزی کردار کنجی پاتما کی ماں ہے جو اپنی توہم پرستی اور جہالت پر قائم ہے اور نثار احمد جیسے تعلیم یافتہ اور جدت پسند لوگوں سے نفرت کرتی ہے۔ یہ ناول اس دور کے مسلم معاشرے کی توہم پرستی پر طنز کرتا ہے۔

بشیر کی دوسری تخلیقات کی طرح یہ ناول بھی ایک چھوٹا ناول ہے اس کی زبان انتہائی شاعرانہ ہے اور جابجا "قرآن شریف" کے حوالے اور فرمودات کے استعمال نے اس کی زبان کو اور خوبصورت کر دیا ہے۔ اس ناول میں بشیر نے مسلم معاشرے کے تاریخ پہلوؤں پر روشنی ڈالی تھی جو کہ اس دور میں بہت ہی خطرناک عمل سمجھا جاتا تھا۔ اس کتاب کے باعث معاشرے کے بڑے بڑے ٹھیکے داروں نے بشیر پر خوب کیچڑ اچھالنے کی کوشش کی۔ ایک زمانے میں تو اس کتاب پر قانونی پابندی بھی عائد کر دی گئی تھی۔

بشیر کے دیگر ناول "استھلتے پر دھان دوین"، "آنواریوم پون کور شم"، "مجیٹو کلکارنٹے مکل" وغیرہ اعلیٰ درجے کے مزاحیہ قصے تسلیم کیے جاتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ بشیر نے ان ناولوں میں بھی اس دور کے معاشرے کی زبوں حالی بیان کیا ہے۔

بشیر کی کہانیوں کی سب سے بڑی خوبی ان کی زبان ہے۔ بشیر نے اپنی کہانیوں کے لئے کیرالا کے مسلم قوم میں بولی جانے والی ملیالم بولی کا استعمال کیا ہے جس کا تجربہ ان سے پہلے ملیالم کے کسی ادیب یا ناول نگار نگار نے نہیں کیا تھا۔ بشیر کی اسی جدت طرازی نے انہیں سب سے ممتاز رکھا اور عوام و خواص میں انہیں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان کی کہانیوں میں معاشیاتی عدمِ مساوات، توہم پرستی، جہالت اور فرسودہ رسم و رواج کے خلاف بڑا گہرا طنز ملتا ہے۔

3) پی سی کٹی کرشنن اروب(1915–1979)

پی سی کٹی کرشنن اپنے قلمی نام اُروب سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ انہوں نے اپنی ساری تخلیقات میں صرف اپنے اس قلمی نام کا ہی استعمال کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ملیام ادب میں یہ صرف "اروب" کے نام سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ اُمّاچو (1958)، مِنڈاپینّ (1956)، سندرگلم سندرن ماروم (1958)، آمنہ (1948)، انی یرہ (1968)، ایّنی (1972) وغیرہ ان کے مشہور ناول ہیں۔

اروب ایک کٹر اور ضابطہ بند سماجی ڈھانچے اور سماج کے اصولوں کی پابندی کرنے والے انسانوں کی روح کی انتہائی گہرائیوں تک پہنچنے والے مصنف ہیں۔ ملیالم ادب میں اروب

کی پہچان ان کی نسائی کرداروں کی وجہ سے ہوتی ہے۔ ملیالم ادب کے عروج کے دور کے سب سے بڑے ادیبوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔

اروب کیرالا کے ایک شہر پونّانی کے رہنے والے تھے جہاں ہندو مسلم ایک ساتھ مل جل کر رہتے ہیں۔ اسی وجہ سے ان کی کہانیوں میں بھی گنگا جمنی تہذیب کا بڑا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ ان کی کہانیوں میں تحریکِ آزادی، تحریکِ خلافت، مالابار فساد وغیرہ جیسے تاریخی واقعات کے پس منظر میں انسان دوستی اور اتحاد کے موضوعات پائے جاتے ہیں۔ ان کی کہانیاں ذات پات اور مذہب کے نام لڑنے جھگڑنے والوں اور اس کے وجہ سے جان و مال کا نقصان جھیلنے والوں کی طرف قاری کا دھیان مبذول کرتا ہے۔

اروب نے اپنا پہلا ناول "آمنہ" تقسیمِ ہند کے موقع پر فرقہ وارانہ فسادات میں مذہبی تعصب پرستوں کے ہاتھوں مارے گئے لوگوں کے نام منسوب کیا ہے۔ یہاں انہوں نے کسی ایک قوم کو نشانہ نہیں بنایا بلکہ مذہب کے نام معصوموں کی جان لینے والوں اور عورتوں کی عصمت دری کرنے والے وحشی درندوں کی اصلی شکل پیش کیا ہے۔

اس ناول کی کہانی ڈاکٹر نایر، آمنہ اور حمید کے ارد گرد گھومتی ہے۔ یہ تینوں بچپن سے ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں۔ نائر آمنہ سے محبت کرتا ہے لیکن سماج سے ڈر کر وہ اپنی محبت کا اظہار نہیں کر پاتا اور وقت اسے مدراس اور اس کے دوست حمید کو مشرقی بنگال کی طرف لے جاتا ہے۔ اٹھارہ برس بعد جب اس کے بچپن کے دوست حمید سے اس کی ملاقات ہوتی ہے تو اسے پتہ چلتا ہے کہ تقسیمِ ہند کے بعد جو فسادات ہوئے تھے اس میں اس کی بیوی آمنہ اور بچے مارے گئے۔ وہ نائر سے اپنی آنکھوں دیکھے واقعات کا ذکر کرتا ہے جہاں ان کے سفر کے دوران ایک اسٹیشن میں "ہرے رام، ہرے رام" کا نعرہ لگانے والوں نے حملہ کیا تو

اگلے اسٹیشن پر "اللہ اکبر" کے نعرے لگانے والوں نے۔ نائر حمید کی باتیں سن کر اور آمنہ کی موت کی خبر سن کر بہت افسوس ہوتا ہے کیونکہ نایر نے آمنہ کی محبت میں ابھی تک شادی نہیں کی تھی اور اسی کی یاد میں اپنی ساری زندگی گزار دی تھی۔

"اُمّاچو" اروب کا سب سے مشہور اور ملیالم ناول کی ایک معرکتہ الآرا تصنیف کہی جاسکتی ہے۔ یہ ناول مالابار کے مسلمانوں کی سماجی زندگی، ان کی زبان، ان کی تہذیب و ثقافت اور تجارت میں ان کی سوجھ بوجھ وغیرہ کی بہترین عکاسی کرتا ہے۔ یہ ناول عشق و عاشقی کے ساتھ درد اور الم کی ایک بہترین داستان ہے۔ ناول نگار نے مٹھی بھر کرداروں کے ذریعے زندگی کے نشیب و فراز کو بڑی خوبی سے بیان کیا ہے۔ اس ناول کی مرکزی کہانی بیران، ماین اور اُمّاچو کی عشقیہ وارداتوں کے اطراف گھومتی ہے۔

ناول میں بیران، ماین اور اُمّاچو بچپن کے ساتھی ہیں۔ بیران اور ماین دونوں اُمّاچو سے محبت کرتے ہیں لیکن اُمّاچو ماین کو چاہتی ہے۔ بیران ایک بڑے گھرانے کا لڑکا ہے جس کی وجہ سے وہ اُمّاچو سے شادی کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ماین اسی غم میں گاؤں چھوڑ دیتا ہے۔ کچھ سال بعد جب وہ لوٹ کے آتا ہے تو اسے اُمّاچو کی اس سے محبت کا پتہ چلتا ہے اور وہ بیران کا قتل کر دیتا ہے اور اُمّاچو سے شادی کرلیتا ہے۔ اُمّاچو اپنی محبت کی وجہ سے سچائی سے آنکھ پھیر دیتی ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اُمّاچو اور بیران کا بیٹا عبدو بھی بڑا ہوتا اور اپنے باپ کے قاتل اور سوتیلے باپ ماین سے کٹا کٹا رہنے لگتا ہے۔ ایک دن وہ ماین اور اُمّاچو کے آگے ماین کو قاتل کہہ دیتا ہے جس کی وجہ سے ماین احساسِ جرم میں مبتلا ہو جاتا ہے اور خودکشی کر بیٹھتا ہے۔

ماین کی موت کے بعد ان کے بچے مرکار اور عیدروس کی ذمے داری بھی اُمّاچو پر آجاتی ہے۔ وہ دونوں عبدو کو اپنے باپ کی موت کا ذمے دار سمجھ کر اس سے دور ہو جاتے ہیں۔ اس طرح خاندان میں پھوٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ کہانی دراصل ایک ایسے عورت کی کہانی ہے جو اپنی محبت کے کھو جانے کے بعد خود کو اپنے بچوں اور خاندان کی بہ حالی کے لئے وقف کر دیتی ہے۔

اس ناول کے ذریعے اروب شخصی زندگی کو مرکز بناتے ہوئے انسانی جذبات کا بیان کرتے ہیں۔ ملابار کے علاقے میں رہنے والے ہندو مسلم آبادی کی آپسی ہم آہنگی، ان کی ترقی اور تہذیب و ثقافت کا بھی اس ناول میں اچھی عکاسی ملتی ہے۔

ان کے ایک اور ناول "سندر گلم سندرن ماروم" میں انہوں نے ذات پات سے پرے انسانیت اور محبت کے ساتھ خاندانی زندگی کا بہترین نقشہ کھینچا ہے۔ گردشِ روزگار کے ذریعے انسان میں، اور انسان کے ذریعے سماج میں آنے والی روایتوں کی سلسلہ وار تصویریں اس ناول میں دکھائی دیتی ہیں۔ اروب کے کردار انسانی جذبات و احساسات کی سچی ترجمانی کرتے ہیں۔ انہیں جیتے جاگتے کردار کہنا غلط نہیں ہو گا۔

اس ناول میں اروب نے اپنا نظریہ پیش کیا ہے کہ دنیا کے سبھی لوگوں میں چاہے وہ گورے ہوں یا کالے، اونچی ذات کے ہوں یا نیچ ذات کے اپنے اعتبار سے حسن اور خوبصورتی پائی جاتی ہے۔ اس ناول میں ملبار فسادات کے بعد کی کہانی ہے جو تین نسلوں تک پھیلی ہوئی ہے۔

اُروب ان کے دور کے دیگر انقلابی ناول نگاران (تکشی یا کیشو دیو) کی طرح نہیں بلکہ وکیم محمد بشیر کی طرح ایک عوامی ناول نگار کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ اروب ایک رشی کی

طرح دھیان میں ڈوب کر اظہارِ فن کا ریاض کرتے ہیں اسی وجہ سے ان کے ناولوں میں شعور کی گہرائیاں پائی جاتی ہیں۔

4) شنکرن کٹی کنجی رامن پوٹےؔ کاڈو(1913–1982)

ایس کے پوٹےؔ کاڈو کی کہانیاں نئے نئے ممالک کی سیر اور وہاں کے سفر کا حال بیان کرتے ہیں۔ انہوں نے بہت سے سفر نامے بھی لکھ کر ملیالم ادب میں سفر ناموں کی فہرست میں اضافہ کیا۔ پوٹےؔ کاڈو نے ایک ایسے دور میں لکھنا شروع کیا جب ساری دنیا بے چین تھی۔ ان کی تحریروں میں شاعرانہ حسن پایا جاتا ہے۔ انہیں ملیالم ادب میں انہیں ایک اچھے ناول نگار کے ساتھ ساتھ ایک باکمال شاعر کی حیثیت سے بھی دیکھا جاتا ہے۔ ان کی کہانیوں اور ناولوں کو پڑھ کر انقلاب کے شعلوں میں جل رہے قاری کے دل کو ٹھنڈک کا احساس ہوتا ہے۔ اس سے یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ ان کے ناولوں میں صرف جذباتیت ہی پائی جاتی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ان کی کہانیوں میں انسانی کشمکش اور جدوجہد کی بھی بہترین عکاسی پائی جاتی ہے۔

ملّکا دیوی (1937)، ناڈن پریمم (1941)، پریم شکشا (1945)، موڈوپڈم (1948)، وش کنیکا (1948)، اورو تریوونڈے کتھا (1960)، اورو دیشتنٹڈے کتھا (1970) اور کوروٹلک (1974) ان کے مشہور ناول ہیں۔ ہندو مسلم اتحاد پر لکھے گئے ان کے ناول "موڈوپڈم" میں انہوں نے سماج کی بقا کا واحد طریقہ باہمی بھائی چارگی اور اتحاد کو بتایا ہے۔ کیرالا کے جنوبی علاقے "تیروتانکور" (Travancore) سے سکون اور عقیدے کی تلاش میں کیرالا کے شمالی ضلع "ویناڈ" کے کوہستانی علاقوں میں آکر کاشتکاری کے کام کے لئے آئے لوگوں کی کہانی اور زندگی کو ناول نگار نے اپنے ناول "وش کنیکا" میں بیان کیا ہے۔ یہ ایک

آوارہ خرام قبیلے کی امیدوں اور مایوسیوں کی کہانی ہے۔ اس ناول کے ذریعے ناول نگار قاری کو یہ پیغام دیتے ہیں کہ انسان کو دنیا میں اپنی بقا کے لئے حرص کی راہ نہیں اپنانی چاہئے۔

ان کا پہلا کامیاب ناول "ناڈن پریمم" ہے۔ اس ناول میں چالیار ندی کے کنارے بسے ایک قصبے موکّم کی کہانی ہے۔ روی ایک شہری ہے جو دو مہینے کے لئے اس قصبے میں رہنے آتا ہے اور وہاں کی ایک لڑکی مالو سے محبت کر بیٹھتا ہے۔ دو مہینے بعد وہ مالو سے واپس لوٹنے کا وعدہ کر کے چلا جاتا ہے لیکن مالو اسے نہیں بتاتی کہ وہ اس کے بچے کی ماں بننے والی ہے۔ کچھ دنوں بعد روی کا ایک خط آتا ہے جس میں وہ مالو کو اپنے یوروپ جانے کی خبر سناتا ہے۔ مالو اب حامل ہے اور بن باپ کے بچے جننے سے خائف ہے۔ اس وقت اکّورن نامی ایک شخص اس کی مدد کرتا ہے جو اس سے محبت کرتا ہے اور اس کے بچے کو اپنے بچے کی طرح پالنے کا وعدہ کر کے اس سے شادی کر لیتا ہے۔ بہت سالوں بعد روی اپنی بیوی پدمنی کے ساتھ واپس لوٹتا ہے۔ روی اور پدمنی کو کوئی بچہ نہیں ہے اس لئے ان کی زندگی میں کوئی خوشی نہیں ہے۔ موکّم پہنچنے کے بعد اس کی ملاقات اس کے اپنے بیٹے راگھو سے ہوتی ہے اور اسے پتہ چلتا ہے کہ وہ اس کا اپنا بیٹا ہے۔ روی مالو اور اکّورن سے راگھو کو اسے سونپنے کی درخواست کرتا ہے۔ اکّورن اس بات سے ناراض ہو جاتا ہے اور اسے پاگل کہہ کر دور کر دیتا ہے۔ روی اس غم میں بیمار پڑ جاتا ہے اور مالو سے درخواست کرتا ہے کہ وہ مرنے سے پہلے ایک بار اپنے بیٹے سے ملنا چاہتا ہے۔ مالو اور اکّورن اس کی حالت دیکھ کر اور اپنی مالی حالت کی وجہ سے اس بات سے راضی ہو جاتے ہیں۔ بعد میں پتہ چلتا ہے دونوں نے راگھو کو روی کو سونپنے کے بعد سمندر میں ڈوب کر اپنی جان دے دی۔ راگھو اب اپنے حقیقی باپ کے ساتھ ہے جو اسے عالی شان زندگی مہیہ کرتا ہے۔

"اورو تریوونڈے کتھا" پوٹّے کاّڈو کا ایک اہم ناول ہے۔ اس ناول کو 1961 میں کیرالا ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ سے بھی نوازا گیا تھا۔ اس ناول میں ناول نگار نے گلیوں میں رہنے والے لوگوں کا قصہ بیان کیا ہے۔ اس ناول میں کئی کردار ہیں جن میں اکثر آوارہ لوگ، طوائف، چور اچکّے، بکھاری، مالدار ساہوکار اور بچوں کی ٹولیاں شامل ہیں۔ اس ناول کا مرکزی کردار کرشنن کروپ ہے جسے لوگ "کروپ"، "پیپر کوروپ"، "وشم استھی تھی" (افسوس کی بات) کے نام سے پکارتے تھے۔ اس کی دس سالہ بیٹی بھی ہے جس کا نام رادھا ہے۔ اس کی پڑھائی اور پرورش کے لئے ہی کروپ اخبار بیچنے کا کام کرتا ہے۔

اس ناول کی کہانی کالی کٹ کے ایک علاقے "مٹھائی تیرو" (مٹھائی بازار) میں رہنے والوں کی ہے۔ اسی وجہ ناول کے ابتدائی حصوں میں ناول نگار نے وہاں رہنے والے لوگوں کی منفرد کہانی بیان کی ہے۔ ناول نگار نے قاری کو اپنے مرکزی کردار کروپ کی نظروں سے کہانی دکھانے کی کوشش کی ہے، لیکن کچھ جگہوں پر اس کی بیٹی رادھا کے نقطۂ نظر سے بھی کہانی بیان کی گئی ہے۔ کہانی کا اختتام رادھا کی موت سے ہوتی ہے جو کسی دماغی مرض کی وجہ سے دنیائے فانی چھوڑ جاتی ہے۔ کروپ پھر بھی اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے زندگی کو آگے بڑھاتا ہے۔ ایک باپ کی مجبوری اور بے کسی کو ناول نگار نے اس ناول میں بڑے دردناک انداز میں پیش کیا ہے۔

مالابار کے زمین داروں اور ان کے مزدوروں کے تعلقات، موپلا انقلاب وغیرہ سماج پر کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں اور کس طرح ایک فرد کی تشکیل میں اثر انداز ہوتے ہیں؟ جیسے سوالوں کے جواب ایس کے پوٹّے کاّڈو نے اپنے ناول "اورو دیشتنڈے کتھا" میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔

ایس۔ کے پوٹّے کاّڈو نے ناول میں 1912 سے لے کر 5 دہائی کا قصہ پیش کیا ہے۔اپنے مرکزی کردار شری دھرن کے ذریعے آدِرانی پاّڈم (Athiranippadam)کی ترقی، لڑائی جھگڑے، وہاں کی عوام کے دکھ درد اور سماجی حالات کا بیان کیا ہے۔

شری دھرن ایک آدرش وادی باپ کرشنن ماسٹر کا آدرش وادی بیٹا تھا۔ شری دھرن نے اپنی کڑی محنت اور لگن کے بل بوتے "سوپر سرکٹ" نامی ایک گروپ میں شامل ہوا۔اس کے باوجود اس گروپ کے کچھ پروگرام کو شری دھرن کا ضمیر قبول نہیں کرتا اور اس کا "Minor" کے نام سے مذاق اُڑایا جاتا۔ شری دھرن کی پہلی نظم کو جب گوند کوروپ نے زبانی یاد کر لی تو اس کی خوشی میں شری دھرن نے پہلی بار شراب کو ہاتھ لگایا۔ شری دھرن کی زندگی میں کئی بار الگ الگ روپ میں محبت کا سامنا ہوا لیکن قسمت نے ہمیشہ اسے ناکام کر دیا۔ پہلی بار اس نے اپنی محبوبہ کو محبت نامہ بھیجا جو ناکام رہا، پھر گھر میں کام کرنے آئی جانو کو بوسہ دینے کی کوشش کی اور بعد میں ایما نامی ایک جرمن لڑکی نے اسے اپنے دامِ محبت میں گرفتار کرنے کی کوشش کی لیکن شری دھرن نے اسے اپنی شاگرد کے روپ میں دیکھا اور استاد شاگرد کے اس مقدس رشتے کو پامال کرنے سے خود کو روک دیا۔

ایس۔ کے پوٹّے کاّڈو نے کنجی کیلو میلان کے کردار سے سرمایہ دارانہ طبقے کی عکاسی کرتا ہے۔ یہ کردار ہر اعتبار سے اپنے عہد کا سب سے سکھی مالدار ہے۔ سارے عیش و آرام سے آراستہ گھر میں رہنے والے اس کردار کے ذریعے ہی ایس۔ کے پوٹّے کاّڈو نے سرمایہ دارانہ طبقے کے زوال کا بیان کیا ہے۔اس ناول کو زمینداری نظام یا سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف لکھے گئے ناول کے روپ میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

ایس۔ کے پوٹّے کاّڈو نے اپنے اس ناول کے ذریعے قاری کو پہلے عالمی جنگ کے پس منظر میں افریقہ، یورپ اور مشرقِ بعید کی سیر کراتا ہے۔ پوٹّے کاّڈو نے اسے ایک سوانحی ناول قرار دیا ہے۔ ملیالم کے ایک مشہور اخبار، ماتر بھومی کے سابق ایڈیٹر پی راجن نے ایس۔ کے پوٹّے کاّڈو کے اس ناول کے بارے میں لکھا ہے کہ اگر یہ ناول ان کی زندگی میں انگریزی میں ترجمہ کیا جاتا تو شاید انہیں ادب میں نوبل ایوارڈ کے لئے بھی نامزد کیا جاسکتا تھا۔

ملیالم کے بڑے ناول نگار بشیر، کیشو دیو، سی وی رامن پلا، ایس کے پوٹّکاّڈ، اروب اور تکشی کے ناولوں میں سماجی زندگی کے مختلف رنگ، زبان وبیان وغیرہ کا ایک جامع روپ پایا جاتا ہے۔ وہ ملیالم ادب کی منفرد ادیب ہیں۔ وہ زندگی کی حسن اور زندگی کی بدصورت کو بھی دیکھتا ہیں۔ قرۃ العین حیدر نے جس طرح اپنے دور کے مسلم سماج کی زندگی کو اپنے ناولوں میں پیش کیا تھا اسی طرح ملیالم ادب میں بشیر اور اروب نے بھی اپنے دور میں اپنے علاقے کے مسلمانوں کی سماجی زندگی کو بڑی کامیابی سے پیش کیا ہے اور اسی وجہ سے ان کی مقبولیت عوام میں بھی بہت زیادہ ہے۔ قرۃ العین حیدر کے ناول "آگ کا دریا" کا ملیالم میں وی بالا کرشنن نے "تی پوژا" کے نام سے ترجمہ کیا ہے۔

اردو ناول کی روایت: پریم چند کا دور اور ان کے ما قبل

ناول تخلیقی ادب کی ایک نثری صنف ہے۔ اردو ادب میں صنف ناول مغرب سے آئی ہے۔ قصہ سننا اور سنانا قدیم زمانے سے انسانی فطرت میں داخل ہے۔ کیوں کہ اس زمانہ میں لوگوں کے پاس فرصت کے اوقات زیادہ ہوتے تھے اس لئے لوگ وقت گزاری کے لئے خیالی قصے کہانیاں سنتے اور سناتے تھے۔ شہر کے کسی میدان میں یا گاؤں میں کسی کے گھر میں یا کسی ایک جگہ جمع ہو کر سب لوگ بار بار اپنی کہانیاں سنایا کرتے تھے اور ان سے وہ لطف اندوز ہوتے تھے۔ اردو نثر کا آغاز داستان سے ہوا۔ داستان کا ایک نقص یہ تھا کہ اس میں خیالی قصے پیش کیے جاتے تھے اور جس میں حقیقت اور سماج کے مسائل نہیں پائے جاتے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ اس میں مافوق الفطرت عناصر بھی ہوا کرتی تھی، جسے حقیقت پسند لوگ قبول نہ کرتے۔

ناول کی وہ خصوصیات جو بادی النظر میں اسے داستان سے ممتاز کرتی ہیں حقیقت نگاری، کردار کی اہمیت اور فلسفیانہ گہرائی ہے۔ حقیقت اگرچہ کسی نہ کسی داستان میں بھی موجود ہے مگر مجموعی اعتبار سے داستان میں محیر العقول واقعات و کردار پیش کیے جاتے ہیں جن کا حقیقی دنیا سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ہے۔ اس طرح وہاں عام حقیقتوں کو بھی خیالی دنیا میں اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ نہ صرف ان کی اصلیت مجروح ہو جاتی ہے بلکہ ان کا ایک رخ ہی سامنے آتا ہے۔ اس کے برعکس ناول میں تخیل اس دنیا کی حقیقتوں کی بازیافت یا ممکنہ ترتیب و تشکیل کے

فرائض انجام دیتا ہے۔ناول میں توجہ کا مرکز کردار ہوتے ہیں جن کا تعلق اسی دنیا کے جیتے جاگتے انسانوں سے ہوتا ہے اس میں واقعات اگرچہ کردار کے تابع ہوتے ہیں لیکن ان کے مابین ایک ناقابل شکست رشتہ موجود رہتا ہے۔

انیسویں صدی میں ہندوستان کے سیاسی وسماجی اور معاشرتی افق پر جو تبدیلیاں رونماہوئیں۔ان کاواضح عکس ہمیں اردوناول میں ملتاہے۔

پریم چند سے پہلے اور ان کے ہم عصر ناول نگار

ڈپٹی نذیر احمد کو عام طور پر اردو کا پہلا ناول نگار تسلیم کیا جاتا ہے۔اردوناول کی بنیاد نذیر احمد کے ناول "مراۃ العروس" سے ہوئی جو 1869 میں منظرعام پر آیا۔اس کے بعد انہوں نے "بنات النعش "توبتہ النصوح "ابن الوقت " ناول لکھے۔اردو ادب کے بیشتر محقق اور ناقدین نے نذیر احمد کو اردو کا پہلا ناول نگار تسلیم کیا۔ اگرچہ اس سے پہلے مولوی کریم الدین ''خط تقدیر'' لکھ چکے تھے اور مختلف ناقدوں نے اس کو ناول مانا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ''خط تقدیر''ناول کے فن پر کھرا نہیں اترتا۔اس میں ان اجزائے ترکیبی کا فقدان ہے جس کی وجہ سے اسے پہلاناول تسلیم نہیں کیا گیا۔

نذیر احمد کی ان قصوں میں ناول کے فارم کے آثار ملتے ہیں زندگی کا جو واضح شعوران قصوں میں موجود ہے۔وہ اس سے پہلے کہیں اور نظر نہیں آتا۔نذیر احمد کی دہلی کے متوسط طبقے کے مسلم گھرانے کے معاملات ومسائل پر گہری نظر تھی انہی کو انہوں نے اصلاح معاشرہ کے پیش نظر قصوں کے اسلوب میں پیش کیا۔ان کے یہ نفسیات ان کے تمام ناولوں

میں نظر آتی ہے۔اور ان کے ناولوں میں اس عہد کی معاشرے کے مختلف مسائل مثلاً مسلمان متوسط طبقے کی نوجوان لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کا مسئلہ اور قدیم وجدید اقدار کی کشمکش سے پیدا شدہ مختلف تہذیبی معاشرتی اور سماجی مسائل کی واقعیت ملتی ہے۔

نذیر احمد نے اپنے ناول "مراۃالعروس" میں دہلی کی ایک متوسط شریف خاندان کی زندگی کی جھلک دکھانے کی کوشش کی ہے۔اس ناول میں نذیر احمد نے لڑکیوں کی تربیت اور ان کی پرورش کے متعلق لکھاہے۔یہ ناول دو بہنوں اصغری اور اکبری کے کردار پر مشتمل ہے دونوں بہنوں کی عادت و فطرت ایک دوسرے کی ضد ہے۔ایک جو سلیقہ مند ہے اور دوسری پھوہڑ ہے۔

نذیر احمد کے ناولوں میں پند و نصیحت زیادہ ہے۔انھوں نے اپنی لڑکیوں کی اصلاح کے لئے ناول لکھے تھے۔

ان کا دوسرا ناول" بنات النعش"۔جس کا موضوع بھی خانہ داری اور اخلاق کی تعلیم ہے۔یہ تصنیف بھی نذیر احمد کی بہت تصنیف میں سے ایک اصلاحی ناول ہے۔

"توبتہ النصوح " نذیر احمد کا تیسرا مشہور ناول ہیں۔جسے انہوں نے1874 میں شائع کیا۔اس ناول کا موضوع بھی نذیر احمد نے اولاد کی تربیت بیان کیاہے۔نصوح اس ناول کا اہم اور مرکزی کردار ہے۔جو اپنی اولاد کی تربیت صحیح طرح سے نہیں کرپاتا ہے۔اس ناول کے ذریعہ نذیر احمد نے عوام کو پیغام دیاہے کہ اولاد کی تربیت اور پرورش تعلیم کے ساتھ ساتھ ان میں نیکی اور دین داری کے جذبات بھی پیدا ہونا چاہئے۔

توبتہ النصوح کے بعد نزیر احمد نے ناول ابن الوقت 1888 میں شائع کیا۔ان کے ناولوں میں ابن الوقت بھی بہت اہم اور بہترین و دلچسپ ناول ہے۔ابن الوقت میں نذیر احمد

نے اپنے دور کے سیاسی اور سماجی مسائل بھرپور طریقے سے پیش کئے ہیں اوراس ناول میں 1857 کے بعد ہوئے قصہ اور عالات کو بیان کیا ہے۔اس ناول کی کہانی بھی بے حد معمولی ہے۔"ابن الوقت " جو اس ناول کا ہیرو ہے۔ دوسرا کردار "حجۃ الاسلام" ہے۔ ابن الوقت جدید تہذیبی قدروں کو پیش کرتا ہے اور حجۃ الاسلام مشرقی تہذیب کی حمایت کرتا ہے۔ انیسویں صدی کے شمالی ہندوستان کے مسلمان انگریزوں کی حکومت میں تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود تین گروپوں میں تقسیم ہوگئے تھے۔

اس کے علاوہ "رویائے صادقہ " اور "ایامی" بھی نذیر احمد کا ناول ہے۔"رویائے صادقہ" ان کا آخری ناول ہے جو 1994 میں شائع ہوا۔یہ دونوں ناول ان کے شاہکار ناول ہیں۔

نذیر احمد کے قصوں میں حقیقت نگاری کا یہ جذبہ زندگی کی تصویر کشی کا رجحان اس کا ارضی اور حقیقی فضا ٹھوس حقیقتوں کا معروضی بیان اور ہم اور آپ سے ملتے جلتے کردار پیش کرنے کا احساس کسی اتفاقی حادثہ کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ ایک طویل عمل اوران کے فنی شعور کا مرہون منت ہے افسانہ کی دنیامیں یہ شعور پہلی مرتبہ نذیر احمد کے ناولوں میں سامنے آیا تھا۔ اس اعتبار سے نذیر احمد اردو کے پہلے ناول نگار ہیں۔

اردو ناول کے ارتقائی تاریخ میں نذیر احمد کے بعد پنڈت رتن ناتھ سرشار نے اس روایت کو آگے بڑھایا۔ان کے ناول فسانہ آزاد کو اردوادب میں ایک سنگ میل کا درجہ حاصل ہے۔فسانہ آزاد اردو کا پہلا معاشرتی ناول ہے۔سرشار منشی نول کشور کے اخبار میں ایڈٹر تھے۔ انہوں نے فسانہ آزاد قسط وار لکھ کر اودھ اخبار میں شائع کیا اور 1880 میں مکمل ناول شائع کیا۔ان کے دوسرے ناولوں میں "جام سرشار"،" سیر کہسار" ، "خدائی فوجدار"، کامنی "،

"پی کہاں "، "رنگ سیاہ "، "طوفان بے تمیز "،" کڑم دھڑم "، "شمس الضحیٰ"، " بچھڑی دلہن "وغیرہ شامل ہیں۔

یہ ناول کے فن کی اعتبار سے کم اور داستان کے سطح پر زیادہ قریب ہے۔ لیکن اپنی تمام کمزوریوں کے باوجود ناول فسانہ آزاد میں اس معاشرے کی پوری عکاسی ملتی ہے جو اُن کے عہد کا تھا۔ سرشار نے ''زندگی کے پھیلاؤ اور اس کی گہرائی کا احاطہ کرنے کی طرح ڈالی۔ انہوں نے صرف لکھنؤ کے معاشرے اوراس کی زندگی کو پیش کیا ہے لیکن اس معاشرے کی یہ ایسی مکمل اور جامع تصویر ہے کہ اس میں زندگی کا ہر پہلو اور ہر جذبہ ملتا ہے۔ اس میں محلوں سے لے کر بازار تک زاہدان خشک سے رنگین مزاجوں تک، بیگمات سے لے کر مہریوں تک، حرم سراؤں سے کوٹھوں تک، معشوق اور عشق پیشہ کی عیاشیوں سے لے کر حسن پردہ نشین کی سادہ پرکاریاں تک، ہر مقام اور ہر شخص کا حال سچا بھی ہے اور دلآویز بھی ہے اس طرح سرشار کے ہاں'' دیوزادوں کی وسعت خیال ملتی ہے زندگی کے مختلف پہلو سرشار اس لئے پیش کرنے میں کامیاب ہوسکے کہ وہ خود ایک رند مشرب آدمی تھے۔ انہوں نے ہر رنگ اور ہر صحبت کو دیکھاہے دراصل سرشار کی کامیابی کی گواہی ''فسانۂ آزاد'' کے ڈھائی ہزار صفحات ہیں۔ "فسانہ آزاد" کے بارے میں ڈاکٹر یوسف سرمست کہتے ہیں۔

> " سرشار کے ناولوں میں فسانہ آزاد" بلاشبہ ان کا کارنامہ ہے۔ فنی طور پر یہی سب سے کمزور ہے۔ یہ نام ہی سے داستانوں سے متاثر معلوم ہوتا ہے۔ اس کی طوالت اور کمزور پلاٹ اور کہانی داستانوں کے اثر کی نشاندہی کرتے ہیں"([16])

16- بیسویں صدی میں اردوناول-یوسف سرمست-ص22

فسانہ آزاد کے بعد سرشار نے اپنا دوسرا معاشرتی ناول "فسانہ جدید" لکھا جو اس زمانے میں اودھ اخبار میں شائع کیا۔ یہ ناول بیس قسطوں میں مکمل کیا۔

اردو ناول کی تاریخ میں تیسرے ناول نگار کی حیثیت سے عبدالحلیم شرر کا نام بہت مشہور ہے اور اردو ناول نگاروں میں بہت اہمیت کا حامل ہے۔ شرر نے اردو ادب میں کئی طرح کے ناول لکھے ہیں اور اس ناول نگاری میں شرر کو تاریخی ناول نگاری کی وجہ سے ان میں نمایاں اور ممتاز حیثیت ہے۔ شرر نے اردو ادب میں کئی طرح کی ناول لکھے ہیں انھیں تاریخی ناولوں کی بانی بھی کہا جاتا ہے اور انھیں اردو کا والٹر اسکاٹ کہا جاتا ہے۔ شرر نے اپنے ناولوں میں مغربی معیار کو پیش نظر رکھا۔ عبدالحلیم شرر کی ناول نگاری 1885 سے شروع ہو کر 1925ء پر ختم ہوتی ہے۔

شرر نے اپنے پہلا ناول "دلچسپ" 1885 میں لکھا۔ انہوں نے اس زنانے کی سماجی و معاشرتی برائیوں کو اپنے ناول کا موضوع بنایا۔ چنانچہ خاندانی اخراجات سے محرومی، رئیس زادوں کے لایعنی مسائل، مغربی طرز معاشرت کے نقصانات، مالی پریشانیاں بغیر دیکھے شادی کرنے کے برُے نتائج بیہودہ رسم وراج اور فضول خرچی وغیرہ ان کے ناولوں میں ملتے ہیں۔

ناول "دلکش" شرر کا دوسرا ناول ہے۔ جس ناول ان کے معاشرتی ناولوں میں نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ شرر نے یہ ناول اپنے سفر یوروپ سے قبل لکھنا شروع کیا۔ اس ناول تین حصوں میں مکمل ہوتا ہے۔1896 کے بعد مکمل مشکل میں شائع کیا۔

شرر کا تیسرا ناول "بدرالنسا کی مصیبت" 1901 میں لکھا جو ایک معاشرتی ناول ہے۔ اس ناول میں معاسشرتی برائی پردے کے رسم ورواج پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس

ناول کے علاوہ انھوں نے اور بھی ناولیں لکھے ہیں۔ جس میں "آغا صادق کی شادی"، "دربار حرام" وغیرہ اس میں اہم ہے۔

"فردوس بریں" شرر کی ایک کامیاب ناول ہے۔ جو 1899 میں لکھا۔ اس ناول کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اپنے قلم کے زور سے مردہ شخصیتوں کو زندہ کر دکھایا ہے۔ اور اس ناول شرر کا نمائندہ ناول ہے۔ جو اپنے ناول کی پلاٹ، کردار نگاری اور مکالمہ نگاری کے اعتبار سے یہ ایک شاہکار ناول ہے۔ اس کے علاوہ "فردوس بریں" کا قصے میں ڈرامائی کی کشمکش موجود ہیں۔

اس ناول کی اہم اور مرکزی کردار حسین ہے۔ اور زمرد اور شیخ وجودی اس ناول کے اہم کردار ہے۔ حسین زمرد کے عشق میں گرفتار ہے۔ زمرد کی موت کا یقین دلا کر حسین کو جنت ارضی میں پہنچایا جاتا ہے۔ وہاں اس کی ملاقات زمرد سے ہوئی۔ پھر اسے دنیا میں بھیج دیا۔ اس ناول میں شرر کی ناول نگاری ان تمام مراحل میں انہوں نے اس ناول کی قصہ کو کامیابی کے ساتھ آگے بڑھانے میں مدد دیتا ہے۔

ناول "فردوس بریں" شرر کا ایک کامیاب ناول ہے۔ جس ناول کو انکا شاہکار ناول کہا جاتا ہے۔ اس کے قصے میں ڈرامائی الجھن بھی موجود ہے۔ ان کو اس ناول کے علاوہ باقی تمام ناولوں میں واقعات اور قصہ میں ایک یکسانیت ملتی ہے۔ ان کے ناولوں کے ایک اہم خوصوصیت یہ ہے کہ ان کے ناولوں میں تاریخی شعور موجود ہے اور تاریخ ناول لکھنے کی طرف زیادہ توجہ کی اور انھوں نے ہیت کے ایک بہترین نمونہ بیسویں صدی کا ناول

نگاروں کو دیا۔ ہیئت کے اعتبار سے یہ ناول ان کا بہترین ناول ہے اور اردو ادب میں ناول کی ہیت میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

ڈاکٹر یوسف سرمست شرر کے ناولوں کا جائزہ لینے کے بعد لکھتے ہیں؛

"ان کے پورے ناولوں میں ہیت کے احتبار سے "فردوس بریں" ہی ان کا شاہکار ہے۔ یہ ناول بھی اردو ناول کی ہیت میں سنگ میل کی حیثیت رر کھتا ہے۔ ناول کا وہ آہنگ جس میں ناول کے پورے عناصر ترکیبی مل کر ایک مکمل تاثر پیدا کرتے ہیں شرر کے "فردوس بریں" میں پوری طرح نظر آتا ہے۔ اس ناول میں پلاٹ، کہانی، کردار، مکالمے، ماحول، جذبات نگاری اور فلسفۂ حیات مل کر وہ آہنگ پیدا کرتے ہیں جو ڈرامائی ناول کا امتیازی وصف ہے"([17])

شرر نے تاریخی ناول لکھ کر نہ صرف ناول کی ایک روایت قائم کی بلکہ ان کی وجہ سے افسانوی ادب کا دامن ماضی کے تاریخی مواد سے پُر ہو جاتا ہے اور قصہ گوئی پلاٹ سازی کی روایات کے علاوہ مکالمہ نگاری، بیانیہ نگارش، منظر نگاری کو ناول کا جُزمانتے ہیں اور اپنے پیش رو ناول نگاروں کے مقابلے میں فن کے زیادہ بہتر اور مکمل نمونے پیش کرتے ہیں اور مغربی صنف ادب کو مشرقی مزاج کے سانچوں میں ڈھال کر ایک نئی راہ نکالتے ہیں اس اعتبار سے ان کی اہمیت ہر دور میں مسلم رہے گی۔

انیسویں صدی کے اردو ناول نگاری کی ارتقائی تاریخ میں محمد علی طبیب کا نام بھی اہمیت رکھتا ہے اور شرر کے مقلدین میں محمد علی طبیب کا نام نمایاں رہا ہے۔ طبیب نے بھی شرر

17۔ بیسویں صدی میں اردو ناول۔ یوسف سرمست۔ ص100

کی طرح معاشرتی اور تاریخی ناول لکھے ہیں لیکن ان کا خاص میدان تاریخی ناول ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو ادب کو تاریخی ناول کا تصور محمد علی طبیب اور شرر نے ہی دیا ہے۔ ان کا پہلا ناول جعفر و عباسہ ہے۔ طبیب کے دوسرے ناول خضر خان ویول رانی میں علاؤالدین خلجی کے زمانہ کے ایک تاریخی واقعہ خضر خان ویول رانی کے عشق کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ طبیب کا تیسرا ناول رام پیاری ہے ان کے دوسرے ناولوں میں نیل کا سانپ، عبرت حسن اور سردار اختر وغیرہ ہیں۔ مجموعی اعتبار سے اگر طبیب کے ناولوں پر نظر ڈالی جائے تو ان کے یہاں فنی شعور کے گہرے نقوش کہیں نظر نہیں آتے ان کے ناولوں کے قصے اوسط درجہ کے پلاٹ سیدھے سادے پیچیدگیوں سے عاری۔ ڈھیلے ڈھالے اور سپاٹ ہیں۔ نہ ہی ان کے یہاں کوئی ایسا کردار ہے جو زندہ رہ سکے۔

اردو ناول نگاری کی تاریخ میں منشی سجاد حسین کا نام بھی مشہور ہیں۔ منشی سجاد حسین کے ناولوں میں حاجی بغلول، احمق الدین، کایا پلٹ اور میٹھی چھری شامل ہیں۔ یہ تمام ناول 1902ء سے پہلے چھپ چکے تھے۔ جیسا کہ ذکر کیا جاچکا ہے۔ یہ ناول اپنے مختلف موضوعات نئے تصورات اور رجحانات کے لحاظ سے بیسویں صدی کی ناول نگاری کی اہم خصوصیات اپنے اندر رکھتے ہیں لیکن اس کے باوجود ان کے ناول اب تک صرف مزاحیہ سمجھے جاتے رہے ہیں۔ علی عباس حسینی نے ان کے ناولوں کو آلۂ تفریح و تفنن قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر احسن فاروقی کہتے ہیں کہ ان کے ناولوں کے کردار ہمیشہ ہنساتے رہیں گے۔ ان دونوں سے آگے بڑھ کر سہیل بخاری یہ کہہ جاتے ہیں کہ ''سجاد حسین کا مقصد ہنسنے ہنسانے کے سوا کبھی کچھ اور ہوتا ہی نہیں۔'' کچھ حد تک یہ اعتراض بجا بھی ہے لیکن اس کے علاوہ بے شمار خصوصیات ایسی ہیں جو انہیں دیگر ناولوں سے ممتاز کرتی ہیں۔

قاری سر فراز حسین عزمی دہلوی بھی ان ناول نگاروں میں سے ہیں جنھوں نے اصلامی ناول لکھے اور شاہد و- ناول اردو کو دیا جیسے ڈاکٹر یوسف سرمست امراؤ جان ادا کا ماخذ قرار دیتے ہیں۔ ان کے دوسرے ناولوں میں سعید، سعادت، بہار عیش، سراب عیش، سزائے عیش شامل ہیں۔ سر فراز حسین عرض کو ان کی اصلاحی ناول کے لئے یاد رکھا جائے گا۔

مرزا عباس حسین بھی اسی دور کے ایک ناول نگار ہیں۔انہوں نے افسانہ اور ڈراموں کی علاوہ ناول بھی لکھے۔ انہوں نے اپنے کرداروں میں بہت جاندار اور دلکش کردار پیش کئے ہیں۔ مرزا عباس حسین کے دو ناول "ربط ضبط "اور ا"فسانہ نادر جہاں "زیادہ مشہور ہیں۔ المیمون 1904ء ان کا غیر معروف ناول ہے۔ علی عباس حسینی نے اپنا ناول سر سید احمد پاشاہ قاف کی پری 1919 میں لکھا۔ "سر سید احمد پاشاہ"یا" قاف کی پری"اور "شاید کہ بہار آئی"ان ناولوں نے بہت مشہور ہیں۔ ناول کے ہیرو سر سید احمد پاشاہ اور ہیروئن طیبہ کے جذبات کو ناول نگار نے بعض جگہ بڑی عمدگی سے پیش کیا ہے۔اس ناول کا بہتر حصہ وہی ہے جس میں ان دونوں کی محبت دکھائی گئی ہے۔ اس لئے مجموعی طور پر ”سر سید احمد پاشا“کو کامیاب ناول کہا جاسکتا ہے۔

اردو ناول نگار کی تاریخ میں محمد ہادی رسوا کا نام بہت مشہور ہیں۔ناول "امراؤ جان ادا" لکھا تو اپنے لئے اردو ادب میں ایک نیا نام رسوا اختیار کیا اور اردو ادب میں طوائف کا ایک نیا قصہ پیش کیا۔ مرزا محمد ہادی رسوا نے متعدد ادبی ناول لکھے ہیں لیکن انھیں صرف "امراؤ جان ادا" کی وجہ سے جانا گیا۔ مولانا عبد الماجد دریابادی لکھتے ہیں؛

"کچھ وضع قدیم کا پاس،کچھ اپنی ثقافت کا لحاظ،داستان سرائی
کرنے بیٹھے تو اپنے چہرے پر مرزا رسوا کا نقاب ڈال لیا۔([18])

مرزا محمد ہادی رسوا کا ناول کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ انیسویں صدی کی آخری دہائی میں ہندوستانی ذہن زندگی کی ایسی نہج پر پہنچ جاتا ہے۔ جیسے نئے سفر کا نقطہ آغاز کہہ سکتے ہیں ۔اس میں بھی داخلی اور خارجی قوتوں کی تحقیق و تلاش کا کام حقیقت پسندانہ انداز میں کیا جانے لگتا ہے۔ ذہن کی اس تبدیلی کا آغاز سب سے پہلے مرزا محمد ہادی رسوا کے ناولوں میں ہوتا ہے۔

اس تلاش و تحقیق کے لئے رسوا نے ناول نگاری کا سہارا لیا اور اپنا پہلا ناول ''افشائے راز'' کے نام سے لکھا۔جو اپریل1896ء میں شائع ہوا لیکن یہ ناول نامکمل تھا۔ رسوا اس ناول میں صرف ایک راز افشا کر کے رہ گئے اور ان کا ذہنی عمل اور فکری کاوش پوری طرح ابھر کر منظر عام پر نہیں آسکی۔اس تشنگی کو دور کرنے کے لئے انہوں نے اپنا دوسرا ناول "امراؤ جان ادا" تصنیف کیا جو ان کا نمائندہ اور شاہکار ناول ہے۔

''امراؤ جان ادا'' ان کا پہلا ناول ہے جس کے ساتھ اردو ناول عہد جدید میں داخل ہوتا ہے اور کشمکش و آویزش کی نوعیت میں تبدیلی آتی ہے ۔خارجی عناصر کے ساتھ داخلی عناصر کو بھی ناول میں شامل کیا گیا ہے۔ناول "امراؤ جان ادا" ایک طوائف کی کہی ہوئی کہانی ہے اور اس میں لکھنؤ کے اودھ کی تہذیب اور معاشرتی نقشے پیش کئے گئے ہیں۔ "امرو جان ادا بنیادی طور پر ایک طوائف نہیں ہے۔وہ ایک شریف گھرانے سے تعلق رکھنے والی ایک لڑکی ہے۔ لیکن واقعات و حالات کے نشیب و فراز اسے گمراہ کرتے ہیں۔اور امراؤ جان اس ناول کا

[18]۔انشائے ماجد۔جلد دوم۔ص-32

اہم یامر کزی کر دار کی حیثیت ر کھتی ہے۔رسوانے جب یہ ناول لکھااس زمانے میں ہندوستان میں طوائفوں کازمانہ تھااور اس وقت طوائفوں کی سماجی حیثیت کے بارے میں کوئی بحث نہیں کی جاتی تھی۔ اس ناول کی کامیابی کاراز رسوا کی اپنی شخصیت اور ذات کا وہ اظہار ہے جو وہ سب سے مخفی رکھنا چاہتے تھے۔نام نہاد امراؤجان اداکے کہنے کے مطابق ''یہ وہ شخص ہیں جو اپنانام تک لوگوں سے چھپاتے ہیں''اس ناول کے کرداروں میں کوئی کردار غیر فطری نہیں سب ایسے ہیں جیسے ہم آپ روزانہ مشاہدہ کرتے ہیں۔ پھر بھی ان میں سے امراؤجان ادا، خانم اور گوہر مرزاکے کردار ضرور ایسے ہیں جو مدت العمر نہیں بھلائے جاسکتے۔رسوانے اس ناول میں اپنی شخصیت کو داخل کرکے بڑا فنی فائدہ اٹھایا ہے ۔پوری تصنیف حقیقت کا آئینہ بن گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے ان کا ناول "امراؤجان ادا"اردو ناول کی فنی محاسن کے اعتبار سے ایک امتیازی درجہ رکھتاہے۔

مرزارسوانے "امراؤجان ادا" کے بعد ناول "شریف زادہ" لکھا۔اس ناول میں انہوں نے عابد حسین کی حیات بیان کی ہے۔یہ ناول فنی اعتبار سے مکمل ہے اور اس کے علاوہ موضوع اور کردار نگاری کی حیثیت سے ایک دلچسپ اور کامیاب ناول ہے۔ ناول میں فدا حسین کی پھوہٹر بیوی اہم کردار ہے۔فدا حسین کے پھوہٹر بیوی کا کردار رسوانے اس زمانے کی جاہل عورت کی برائیوں کو پیش کرنے کی ذیل میں کیاہے۔ناول "شریف زادہ"کا موضوع بھی "امراؤجان ادا" کی طرح لکھنؤکی تہذیب اور معاشرتی حاالات کی عکاسی کرناہے۔

"شریف زادہ " کے بعد رسوانے اپنا ناول "ذات شریف"1900 میں شائع کیا۔اس کے پس منظر میں وہ لکھنوی تہذیب ومعاشرت کے مختلف پہلوؤں تعیش پسندی وغیرہ کے جیتے جاگتے مرقع پیش کئے ہیں۔علاوہ ازیں اس میں انہوں نے لکھنؤکی سفید پوش لیڈروں

کی سازشوں کو پیش کرتے ہیں۔ اس ناول میں سوانحی انداز میں عہد جہد کے ایک ایسے انسان کو پیش کیا جس کے لئے بے مشقت دولت ہاتھ آنے کے لئے تمام ذرائع مسدود ہو چکے ہیں۔ لیکن عمل کے دروازے کھل گئے ہیں اور وہ اب تمام قوتوں کو مجتمع کر کے قسمت اور سماج کو شکست دیتا ہے اوراپنے لئے ایک نئی دنیابناتا ہے۔ دراصل رسوا نے اپنے تینوں ناولوں میں لکھنؤ کی تہذیب و معاشرتی حالات کو بیان کیا ہے۔ رسواخود اپنے ان تین ناولوں کے بارے میں کہتے ہیں؛

> "میری ناولیں شریف زادہ"ذات شریف"اور امراؤجان ادا" آپس میں ایک قسم کا اندرونی تعلق رکھتی ہے۔ شریف زادہ کا کردار مجھ سے ذرابلند تر اور ذات شریف کا پست تر ہے۔امراؤ جان کے ہاں میں نے چند باتیں ڈال دی ہیں جو اپنے سے منسوب کرتے شرم آتی ہے"([19])

رسواکاآخری طبع زاد ناول "اختری بیگم "(1924ء) میں منظر عام پر آیا۔ اس ناول کا موضوع طبقاتی کشمکش ہے۔ یہ بھی ایک سوانحی انداز کا ناول ہے۔ جس میں ایک امیر زادی کی زندگی کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔ اختری بیگم ناول کا مرکزی کردار ہے اور اس کی ذریعہ ناول کی کہانی سامنے آتی ہے۔ یہ ایک پکارسک ناول ہے ان کے دوسرے ناولوں میں "بہرام کی رہائی،""خونی عاشق"، خونی بھید "خونی جورو"اور" طلسمات "وغیرہ شامل ہیں۔ اردو ناول نگاری کی تاریخ میں مرزارسواایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنے ناولوں کے ذریعہ سماجی حقیقت نگاری کو ناول میں ایک نقش بنانے کی کوشش کی۔ کردار نگاری کی نفسیات میں

---

[19]-اردوناول کاارتقا- عصمت النسا-ص-142

امراؤ جان ادا اہم مقام رکھتی ہے۔اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اردو ناول نگاری کی ارتقائی تاریخ میں اپنے ناولوں کی ذریعہ اہم حصہ ادا کیا ہے۔

مرزا محمد سعید نے خواب ہستی 1905ء میں پہلاناولٹ اور دوسرا ناولٹ یاسمین1908ء میں شائع کیا۔ نیاز کے ناولٹ ایک شاعر کاانجام1913 اور ، شہاب کی سرگزشت اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کے علاوہ کشن پرشاد سماجی حیثیت نگاری کے لئے اہم ناول ہے۔

اس دور میں جہاں راشد الخیری سماج میں پھیلی ہوئی برائی کو نظر انداز کر کے صرف اچھائی کی طرف دیکھتے تھے وہیں مرزا محمد سعید دونوں پہلوؤں کی عکاسی کرتے تھے۔ مرزا محمد سعید سے قبل کسی ناول نگار نے زندگی کے مسائل میں ڈوب کر فرد کے ذہن کو اس کی گہرائیوں میں جاکر نہیں دیکھا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے فرد اور جماعت کے باہمی رشتے کے ناگزیر قرب کو کہانی کا موضوع بنایا تھے۔ان کے ناولوں میں مشرق و مغرب دونوں تہذیبوں کی بہترین خصوصیات دیکھنے کو ملتی ہے۔ انہوں نے زندگی کے مسائل کو کہانی کے فنی وسیلے سے حل کرنے کے امکان پر غور کر لیا تھا۔

پریم چند کے دور میں ہی رومانی تحریک کا دور آتا ہے۔ یہ ایک ایسا دور تھا جو مرزا محمد سعید اور راشد الخیری سے ہٹ کر اپنی نئی راہ کی تلاش میں تھا۔ اس دور میں ادب کا ایک گروہ خیالی دنیا میں پرواز کر کے اپنے سکون کا سامان مہیہ کر رہا تھا۔ ان کے نزدیک دنیا میں محبت اور عشق کے سوا کچھ نہیں اور ان میں جنس پرستی سے متعلق آزاد خیالات تھے۔

اس دور کا سب سے مشہور ناول نگار نیاز فتح پوری ہے۔ان کے ناولوں میں "شاعر کا انجام" اور "شہاب کی سرگزشت" بہت مشہور ہوئے۔ "شہاب کی سرگزشت" کا اسلوب بہت

اچھا ہے۔ اس کے مطالعے کے دوران قاری بوجھل پن محسوس نہیں کرتا۔ انہوں نے اردو ناول نگاری کو ایک نئی جہت سے آشنا کروایا۔

اسی دور کا ایک اور اہم ناول نگار کشن پرشاد کول ہے جنہوں نے 1917 میں ایک رومانی ناول "شیاما" لکھا۔ ان کا یہ ناول اس دور کے نظام کے خلاف ایک احتجاجی آواز تھا۔ اس ناول کی سب سے بڑی خصوصیت اس کا مباحثاتی انداز تھا۔ ان کی ناول نگاری میں انقلابی رجحانات کا پل بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

مختصراً یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ ناول کی ابتداء یعنی نذیر احمد سے پریم چند تک اردو ناول کا سنہری دور رہا ہے۔ اس عہد کے ناول نگاروں کو اردو ناول نگاری کی تاریخ میں یا آغاز وارتقاء میں ہمیشہ یاد کیا جاتا رہے گا۔

بابِ سوم

ناول "گئودان اور کائر" کا تقابلی مطالعہ

ناول "گودان اور کائر" کا تقابلی مطالعہ

ملیالم زبان ہندوستان کے آئین میں شمار 18 پر بڑی زبانوں میں سے ایک زبان کے طور پر موجود ہے۔ ملیالم زبان میں ادبی تخلیقات کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ جبکہ تکشی کے ناول "چمین" (جھینگا) کے بعد ہی مغربی دنیا میں ملیالم ادب کا تعارف ہوا۔ کاوٹلیا (Kautilya) کی "ارتھ شاستر" ملیالم اور تامل زبان سے ملی جلی ایک اور زبان میں بھی لکھی گئی تھی۔ 15ویں صدی میں کئی مذہبی کتب اور پُران ملیالم ادب میں نثری شکل میں لکھے گئے۔ اسی طرح ہندوستان میں پرتگالیوں کی آمد کے بعد عیسائی مشنریوں کے ذریعے بھی کئی کتابیں نثری شکل میں ملیالم زبان میں منظرِ عام پر آئیں۔

پرنٹنگ پریس کے آجانے کے بعد ملیالم میں کتابیں اور رسائل لکھنے اور چھپنے کی رفتار اور تیز ہوگئی۔ 1563 میں کوچی میں پہلے پریس کا قیام عمل میں آیا۔ 1580 تک دو اور پریس کا اضافہ ہوگیا۔ جیسے جیسے پریس کام ہوتا گیا اسی طرح ملیالم ادب میں بھی کتابوں کا اضافہ ہونے لگا۔ 1889 میں منظرِ عام پر آئی چنتو مینون کی "اندولیکھا" ملیالم کی پہلی ناول قرار پائی۔ لیکن ملیالم ادب یا ملیالم ناول کو اس کے افق پر پہنچانے کا کام سب سے پہلے تکشی نے ہی کیا تھا۔

اردو ادب کی تاریخ یا اردو ناول کی تاریخ میں پریم چند کا جو مقام ہے ٹھیک اسی طرح ملیالم ادب یا ملیالم ناول کی تاریخ میں تکشی کا بھی مقام بہت اونچا ہے۔ تکشی کے ناولوں نے بھی پریم چند کی طرح اپنی تحریروں سے ادب کو ایک نئے جہاں اور ایک نئے زاویے کی جانب سوچنے پر مجبور کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ تکشی اور پریم چند کے ناولوں کا تقابلی مطالعہ کرنا ادب کے طالبِ علموں اور ادب سے محبت رکھنے والوں کے لئے سود مند ثابت ہو گا۔ تکشی اور پریم چند دونوں کے ناولوں میں اس دور کے سماجی حالت، کسانوں اور غریبوں کی گھریلو زندگی، ان کے مسائل جیسے موضوعات پائے جاتے ہیں۔ ایک جیسے موضوعات ہونے کے باوجود دونوں ناول نگاروں کی علاقائی خصوصیات اور تہذیبی اختلاف نے ان کے ناولوں میں مماثلت کے ساتھ ساتھ افتراق بھی پیدا کیا ہے۔ اس کی وضاحت ان دونوں ناول نگاروں کے ناولوں کے پلاٹ، کردار نگاری، اسلوب، زماں و مکان میں دیکھا جا سکتا ہے۔

اس باب میں ملیالم ادب میں اپنا ایک خاص مقام بنانے والے تکشی کے مشہور ناول "کائر" اور اردو ادب میں ایک نئے باب کا اضافہ کرنے والے پریم چند کا مشہور ناول "گؤدان" کا تقابلی مطالعہ کیا جا رہا ہے۔ آج کے اس ترقی یافتہ اکیسویں صدی میں انسان کو سماجی حقیقت شناسی اور انسانی قدروں کی اہمیت کو سمجھانے کے لئے اس طرح کے ناولوں کا تقابلی مطالعہ یا ان ناولوں کی قراتِ ثانی انہیں اپنی بھاگ دوڑ کی زندگی میں سکون کا ذریعہ عنایت کرے گی۔

ادب کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہر زبان میں چاہے وہ اردو ہو یا ملیالم جب بھی کوئی ادبی فن پارہ معرضِ وجود میں آتا ہے تو وہ اپنے دور کے سماجی، ثقافتی اور معاشی حالات کی عکاسی کرتا ہے۔ یہی حال "کائر" اور "گؤدان" دونوں ناولوں کا ہے۔ ان

دونوں ناولوں نے اپنے دور کے کسانوں کی زندگی، سماجی تبدیلیاں، زمینداروں کے ظلم و ستم، ایک فرد کی زندگی، احتجاج، زمین، ذات پات کے مسائل، مال و دولت کی وجہ سے بکھرے سماج، فرسودہ رسم ورواج، جہیز، سیاسی و معاشی صورتِ حال وغیرہ کا بیان کیا ہے۔ ان چیزوں کے بیان میں دونوں ناول کس حد تک ایک دوسرے سے مماثل ہیں اور کس حد تک دونوں میں افتراق ہے اس کی نشاندہی کرنا ہی اس باب کا مقصد ہے۔ کسی بھی فن پارے کے تقابلی مطالعے کے لئے اس کا فنی و موضوعاتی تجزیہ کرنا ضروری ہوتا ہے۔

ناول "گئودان" اور "کائر" کا فنی تجزیہ

تکشی نے اپنی زندگی کے تجربات سے اپنے ناول "کائر" کے کرداروں کا انتخاب کیا ہے۔ "کائر" کی کہانی ڈھائی صدی اور چھ نسلوں تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس میں ان کی زندگی، ان کی سماجی حالت، مکالمے، رسم و رواج خاص کر گھر جمائی بننے کا رواج، موپلا انقلاب، عالمی جنگ، جدوجہدِ آزادی، مقامی حکومت کا رویہ وغیرہ کا احاطہ کیا گیا ہے۔

تکشی کہتے ہیں کہ ان کے ذہن کی آنکھوں میں ڈھائی صدی کے کیرالا کی سماجی زندگی گھوم رہی تھی لیکن اسے کسی خاص ساخت میں ڈھالنے کا حوصلہ انہیں نہیں مل رہا تھا۔ انہوں نے کئی مغربی فن پاروں کا مطالعہ کیا لیکن پھر بھی انہیں اپنے مقصد میں کامیابی کے لئے راہ دکھائی نہ دیتی تھی۔ سالوں تک کیرالا کی سماجی زندگی کے حالات ان کے ذہن میں گھومتے رہے۔ سالوں تک یہ کیڑا ان کے ذہن میں پنپتے پنپتے بڑا ہوتا گیا۔ آخر کار ایک بے نیند رات کو اپنے خیالوں میں کھوئے ہوئے تھے کہ ان کے ذہن میں روشنی کا ایک دھماکہ ہوا آنکھوں کی روشنی چمک اُٹھی ان کے سوچتے ہوئے ذہن نے انہیں مہابھارت کی ساخت میں اپنی کہانی بیان کرنے کی ترکیب سوجھائی۔ اگلے ہی دن سے انہوں نے "کائر" لکھنا شروع کیا اور تین سال کی مسلسل محنت کے بعد یہ عظیم ناول پایۂ تکمیل کو پہنچا۔

ڈھائی سو سالہ کے زمانے کی مدت میں پھیلے اس عظیم ناول میں کئی کہانیاں اور کئی کردار پیش کیے گئے ہیں۔ قصبہ کوٹاناڈو کو مرکز بناتے ہوئے وہاں کے زمینداری نظام کے

بدلتے رنگ کے ساتھ ساتھ کیرالا کے سیاسی، سماجی و معاشی حالات میں درپیش تبدیلیاں اور لوگوں کے نظریات وافکار کی عکاسی میں تکشی کامیاب رہے۔

یہاں اگر اردو کے مشہور ناول نگار پریم چند کے ناول "گؤدان" کی بات کی جائے تو یہ ناول ترقی پسند تحریک کے عہد کا ہی نہیں بلکہ پورے اردو ناول کی تاریخ کا سب سے اہم ناول مانا جاتا ہے ۔ناول" گؤدان" ایک تاریخی ،ایک تہذیبی اور ایک پورے دور کا ترجمان ہے۔ پریم چند نے اپنے ناول کو کسانوں اور دیہاتیوں کی زندگی کا عکاسی بتایا ہے۔اس ناول کا اصل موضوع کسانوں کی زندگی ہے۔اس ناول میں کسانوں کی سماجی و معاشی زندگی کے تمام پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ پریم چند کو اپنے زمانے کے کسانوں اور دیہاتیوں کی زندگی کو قریب سے دیکھنے اور ان کے مسائل کا مطالعہ کرنے کا موقع ملا تھا۔

ناول گؤدان میں ہوری کا کردار پورے سماج کا نمائندگی کرتا ہے۔ کہ اس میں سماج کی اچھائی اور برائی ہر چیز نظر آتی ہے۔اور پریم چند نے ہندوستان کے پورے کسانوں کی خواہشات اور ان کے خواب اپنے ناول میں بیان ہے۔

اس ناول میں بیلاری گاؤں کے کسان ہوری اور اس کی بیوی دھنیا کی زندگی کو بیان کرتے ہوئے ناول آگے بڑھاتے ہیں۔ اور کسان ہوری کی ایک پوری زندگی کی عکاسی ملتی ہے۔ یہ پریم چند کی حقیقت نگاری کی سچی تصویر کشی کی مثال ہے۔ پریم چند نے اس ناول میں بیلاری گاؤں کے سماجی حالات اور رسم ورواج اور اس زمانے کا سماجی معاشرتی حالات کو ہوری کی زندگی کے ذریعہ پیش کیا ہے۔

سماج میں کسانوں کی جگہ، وہاں کے شادی کی ماحول، کسان، جہیز اور زمین وغیرہ کے حالات وواقعات اس ناول میں بیان کئے گئے ہیں۔

یہ ناول پریم چند کی محنت اور غور و فکر کا ماحصل ہے اور اس ناول میں حقیقت نگاری اور صناعی درجہ کمال پر ہے اور یہ ناول ان کا ایک کامیاب اور اس زمانے کے ہندوستان کا ایک سچا آئینہ ہے۔ اور اس میں زندگی کی حقیقی اور سچی تصور بولتی ہوئی نظر آتی ہے۔

(1) قصہ

ناول میں زندگی کے واقعات و تجربات کی عکاسی ہوتی ہے۔ ایک اچھاناول نگار وہی ہوتا ہے جو اپنے قاری کو مطمئن کرنے میں کامیاب ہو، اور قاری اسی وقت مکمل طور پر مطمئن ہوتا ہے جب ناول کے طرزِ بیان میں قصہ پن ہو۔ ای ایم فاسٹر کا قول مندرجہ بالا جملے کی تصدیق کی دلیل ہے:

> "ناول ایک قصہ کہتا ہے۔ یہ وہ بنیادی پہلو ہے جس کے بغیر ناول، ناول نہیں ہو سکتا۔ یہ اعلیٰ ترین عنصر ہے جو تمام ناولوں میں مشترک ہے۔"([20])

قصہ کے عنصر سے ہی ناول میں دلچسپی پیدا ہوتی ہے اور قاری کو لطف و مسرت ناول کی اسی خصوصیت سے ملتی ہے۔ دراصل انسان کے جذبۂ تجسس کی تسکین اسی قصے پن کی وجہ سے ہوتی ہے اور اسی لئے قاری کے اندر مسرت کی کیفیات اُمڈ آتی ہے۔

20۔ آسپکٹس آف ناول- ای ایم فراسٹر - ص34

ڈھائی سو سالہ مدت میں پھیلے ہونے کی وجہ سے ناول کائر میں کئی قصے پائے جاتے ہیں۔بادی النظر میں یوں لگتا ہے کہ ان قصوں کا آپس میں کوئی تعلق نہیں لیکن کہانی کے آگے بڑھتے بڑھتے قاری اس سے مانوس ہوتا جاتا ہے۔

کائر کو کئی کہانیوں اور کئی کرداروں کا ایک سنگم کہنا صحیح ہوگا۔ تکشی نے اپنے اس ناول میں کیرالا کے قصبے "کوٹاناڈو"(Kuttanad) کو مرکز بناتے ہوئے کیرالا کی سماجی، سیاسی اور معاشی صورتحال میں ہونے والی تبدیلی کی وجہ سے افراد میں ہونے والے بدلاؤ کو واضح کیا ہے۔

ملیالم کے مشہور ناقد ایّپہ پنی کر(ayyappa panicker) کے بقول،"ناول کائر اپنے گاؤں والوں کی کہانی کو پوری دنیا تک پہنچانے کا تکشی شیوشنکر پلائی کے 50 سالہ محنت کا ثمرہ ہے۔"([21])

کائر کی تخلیق اس دور میں ہوئی جب تکشی مارکسزم سے دور ہٹنے لگے تھے۔ساٹھ اور ستر کی دہائی میں جو مارکسزم کے خلاف لکھے جانے والا زمانہ جاتا تھا وہ کائر میں بھی دیکھا جاسکتا ہے۔پھر بھی کائر کے موضوع اور مکالموں میں مارکسی رنگ بھرپور ملتا ہے۔اس ناول میں ایک کردار "سریندرن" ایک عام پارٹی کاریہ کرتا ہے۔اس کردار کے ذریعے تکشی نے یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ سماجی تحریک سماج میں کس طرح ایک فرد کی زندگی میں بدلاؤ لے آتی ہے۔ سریندرن ایک ایسا کردار ہے جو سماج کی بھلائی کے لئے کوشاں ہے۔ سماج کا ایک حصہ ہونے کی وجہ سے اس کے اندر بھی بہت کمیاں تھیں۔ایک زمانے تک کمیونزم کے ساتھ جڑے رہنے کے بعد اس نے کمیونزم سے دوری اعتبار کرلی اور اس انقلابی زندگی کو خیر آباد کر

21- مضامین-زمین اور کائنات،ناول کائر میں۔ایّپہ پنی کر

دیا جس کی وجہ سے وہ ایک گمنام سی زندگی گزارنے لگا۔ تکشی اس ناول سے یہ سبق دیتا ہے کہ انسان کی زندگی میں ہونے والی تبدلیاں سماج کی بھلائی کے لئے ہونی چاہئے۔

وقت کا پہیہ آگے بڑھتا جاتا ہے اور سریندرن کی زندگی میں جھٹکا اس وقت آتا ہے جب اسے پتہ چلتا ہے کہ اس کا بیٹا سلیل نکسل وادیوں کے ساتھ مل چکا ہے اور انقلاب کی راہ میں نکل چکا ہے۔ ناول میں سریندرن اور سلیل کے درمیان پائی جانے والی ذہنی تناؤ کو بڑے اچھے انداز سے پیش کیا گیا ہے۔

کائر ایک اور اہم کردار "کنجن پلائی" ہے۔ اس کردار کے ذریعے ناول نگار نے گاندھی وادی نظریہ کو پیش کیا ہے۔ یہاں ناول نگار نے جاگیر دارانہ نظام اور زمینداری نظام میں صدیوں سے ہونے والے ظلم و ستم کو کرداروں کے ذریعے قاری تک پہنچایا ہے۔ ناول میں ملبار فساد کے ذکر کے ساتھ ساتھ اس زمانے میں سماج کے اعلیٰ طبقے کے برہمنوں کو درپیش مشکلات اور پریشانیوں کی داستان بھی ملتی ہے۔

تکشی نے اپنے ناول میں پرانی سامراجی خاندانوں کے خاتمے کی ایک بہت تفصیلی تصویر پیش کی ہے۔ بہت سے نائر خاندان جن کی اقتصادی حالت بحال نہ تھی اپنے جھوٹے وقار کو برقرار رکھنے کے لے تقریب منعقد کرتے تھے۔ مثال کے طور پر، کاٹکتھرا خاندان کی دولت کولل ماتھائی کے قبضے میں آجاتی ہے، اور چیروتا کی دولت ساہوکار پیرو کنو کو دے دی جاتی ہے۔ کوڈنتھرا اور کونوتھ خاندانوں کی دولت بھی الگ الگ بٹ جاتی ہیں۔ بدلتے سماجی اور سیاسی حالات سامراجی خاندانوں کی زندگی کو بھی متاثر کرتی ہے۔ مادری نظام کے خاتمے اور میراث کے نئے قوانین کو نافذ کرنے کے نتیجے کے طور پر، بہت سے خاندانوں کی ملکیت کو بہت سے چھوٹے پلاٹوں میں تقسیم کیا گیا۔ جس کے پیش نظر منگلاشیری خاندان جو کہ اس علاقے کا سب

سے مالدار خاندان تھا، ان کے خاندانی گھر کی جگہ میں بہت سی چھوٹی جھونڑیاں آ گئیں۔ پرانے مالدار خاندانوں نے نہ صرف اپنے مال و دولت سے ہاتھ دھویا بلکہ ان کی عزت اور وقار بھی مٹی میں مل گئی۔ ان خاندانوں کے زیادہ سے زیادہ لوگ مزدوری کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ پھر بھی ان میں سے کچھ عیسائیوں اور مسلم سرمایہ داروں کے تحت مزدور بن کر اپنا پیٹ پالنے کے لئے مجبور ہو جاتے ہیں۔ نئے عیسائی سرمایے دار وٹاتھرا پیلی اور پاروتکاٹ اوطاماپلا اور پرید ساہوکار جیسے مسلمان سرمایہ دار پہلے نائر اور برہمن سرپرستوں کے لئے کام کیا کرتے تھے۔ ویٹی کاٹ خاندان جیسے نائر خاندانوں نے اپنی محنت اور لگن کے بل بوتے اپنا مقام برقرار رکھنے میں کامیاب رہے۔ کٹو کوروپ، نانو کوروپ اور کیشو کوروپ نے اپنی کھیت میں خود کام کیا۔ پرے تھراپاچو جیسا غریب شخص اپنی سخت محنت کی مدد سے ساہوکار پاچو کے نام سے موسوم کیا جانے لگا اور بہت بڑا مالدار بن جاتا ہے۔ علاقے کے بہت سے بڑے خاندانوں کے زوال کے ساتھ ساتھ مزدوروں اور جاروب کشوں کے خاندان ترقی کرنے لگے۔

لیکن مصنف یہ ظاہر کرنے سے نہیں چوکے کہ غریب عوام کی اچانک اقتصادی ترقی سماج کے لئے ایک اچھا شگون نہیں ہے۔ نئے سرمایے دار اخلاقی طور پر گرے ہوئے ہیں۔ ان کا خاندانی رشتہ مضبوط نہیں۔ ان کی دلچسپی صرف مال جمع کرنے میں ہے۔ مثال کے طور پر، ساہوکار پریتراپاچو کو اپنے بچوں کی تعداد بھی یاد نہیں جب کہ ان کی تعداد بہت کم ہے۔

ہم ناول سے یہ سیکھتے ہیں کہ کس طرح سیاسی پیش رفت اور سماجی اصلاحات انسانی زندگی میں تیزی سے تبدیلیاں لے آتی ہیں۔ ناول میں پیش کردہ واقعات کے ذریعے چھوا چھوت اور مادری وراثت جیسے برے رواجوں کے خلاف جدوجہد کی گئی ہے۔ ناول میں ایسے ترقی پسند ہندو کردار بھی ملیں گے جو خود اپنے ہم مذہب لوگوں سے ذات پات جیسے فرسودہ رواجوں

کے خلاف برسر عمل ہیں۔ اس ناول میں اس کی بہترین مثال کنجن نائر ہیں جو ذات پات کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں اور انہیں ہندووں کے مزاحمت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ "پُلیا، پریا اور چیوا (یہ نچلے ذات ہیں) کے لئے ایک اسکول کھولنے جارہا ہے۔ منڈ پتو واتل (اس دور کا سرکاری تعلیمی ادارہ) سے حکم نامہ آگیا ہے۔" یہ الفاظ ایک پوری قوم کو ہلا کر رکھ دیتی ہے، جو اس فیصلے سے بالکل راضی نہیں لیکن وہ کچھ کر بھی نہیں سکتے کیونکہ حکم نامہ سرکار کی طرف سے جاری کیا جاچکا ہے۔ زندگی میں تبدیلیاں آنے لگی تھیں چاہے اسے لوگ پسند کریں یا نہیں، اس کا مشاہدہ کرتے ہوئے ایشورارو کہتا ہے، "باپ نے اس کی صحیح نشاندہی کی تھی۔ یہ تبدیلی کا اشارہ ہے۔ ہمیں پتہ بھی نہیں چلے گا اور ہم بدل جائیں گے۔ سیلاب کا پانی بڑی تیزی سے گزر رہا ہے۔ ہم اسے ریت کی باندھ سے نہیں روک سکتے۔ یہی دنیا کا دستور ہے۔" ناول میں نسل در نسل ہونے والی تبدیلیوں کی بھی عکاسی کی گئی ہے۔ یہاں پرانی نسل جہاں تبدیلی نہیں چاہتی وہیں نوجوان نسل تبدیلی کے حق میں کھڑے نظر آتے ہیں۔

ناول میں سیاسی ارتقاء کا آغاز مہاراجہ کی حکمرانی سے شروع ہوتی ہے۔ سیاسی ترقی کے دوسرے مرحلے میں آزادی تحریک میں عوام کی شرکت اور ذمہ دار حکومت کے لئے جدوجہد، کانگریس کے کارکنوں کی سرگرمیاں، کانگریس کی حکومت ، کمیونسٹوں کی سرگرمیاں، کمیونسٹ حکومت اور آخر میں نکسالائٹ کی سرگرمیاں ہیں۔

"ناول" پر منعقد ایک بزم کو خطاب کرتے ہوئے، تکشی نے کہا: "میں نے اپنے ناول کائر میں ملیالم کی اصل میں لوٹنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن ہر پیراگراف لکھتے وقت میں حد بندی کی پرانی وادی میں پھلستا جارہا تھا۔"([22])

ناول گؤدان پریم چند کا ایک شاہکار ناول ہے۔ جو ان کے انتقال کے ایک سال بعد میں اردو میں شایع کیا اور ان کے تمام ناولوں میں سے گؤدان کو سب سے بہترین ناول کا درجہ حاصل ہے۔ اس میں ہندوستان کی کسانوں کی تکلیف وہ زندگی کو دکھایا گیا ہے۔ ان کے ناول گؤدان میں ادب زندگی کی تنقیدی تصویر بن گیا ہے۔ پریم چند نے کسانوں پر ہونے والے ظلم کی نقشہ کشی ہے۔ یہ بیلاری گاؤں کا عوامی اور کسانوں کی زندگی کا نقشہ ہے۔ اس ناول میں کسانوں اور دیہاتیوں کا درد و دکھ بیان کیا گیا ہے۔ یہ ناول 580 صفحات پر مشتمل ہے اور جس میں 26 ابواب ہے۔ ناول گؤدان سب سے پہلے دیوناگری رسم الخط میں لکھا گیا تھا۔ لیکن اس میں ان کا ہندی اور اردو اسلوب بہت کچھ ایک دوسرے سے قریب آگیا تھا۔

اس ناول کی کہانی یہ ہے کہ بیلاری گاؤں میں ہوری نام سے ایک کسان رہتا تھا۔ اس کی بیوی کا نام دھنیا ہے۔ جو نہایت سلیقہ مند عورت تھا۔ ہوری کو ایک لڑکا اور دو بیٹیاں ہیں۔ لڑکا گوبردھن (گوبر) ایک باغی قسم کی نوجوان ہے۔ اس نے گاؤں کی مزدور اور کسانوں کی نظام کو بدلنے کی کوشش کی اور وہ زمینداروں کے دیگر قسم کے حقوق سوائے لگان کے نہیں دینا چاہتا اور زمینداری اور سرمایہ داری کے خلاف اپنی وسعت بھر بغاوت کرکے پوری زندگی بسر کر دیتا ہے۔ گوبر جو لکھنؤ جاکر وہاں کے زندگی میں رنگ جاتا ہے۔ پریم چند نے اس ناول

22۔ کائر دیباچہ۔ تکشی۔ ص 6

میں مزدور اور سرمایہ دار کی کشمکش کو بھی موضوع بنایا ہے۔ اس ناول میں ہوری مرکزی کردار ہے اور ہوری کی سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ اپنے دروازہ پر ایک گائے بندھی ہوئی دیکھے۔ یہ اس زمانے کے کسانوں کا ایک خواب تھا۔

اس ناول کا ہیرو ہوری ہے اور وہ بہت محنت کش ہے۔ اور اس ناول کی آخری میں وہ مزدوری کی جگہ پر مر جاتا ہے۔ سماجی و معاشرتی جبر اور سماجی ناہمواری کے رویے بھرپور طور پر اس ناول میں دکھائی دیتے ہیں۔ یہ ناول ہندوستانی دیہی معاشرے میں جبر اور استبداد کی ایک واضح جھلک دکھاتا ہے۔

(2) پلاٹ

پلاٹ کا تعلق قصے کے نظم و نسق سے ہوتا ہے۔ بظاہر یہ کہانی کا ہی ایک جز ہے کیونکہ کہانی سے الگ اس کا تصور ناممکن ہے۔ لیکن فنی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اس کی حیثیت انفرادی ہوتی ہے۔ یہ کہنا بھی غلط نہ ہو گا کہ پلاٹ قصے کی تزئین و آرائش ہے یا پھر قصہ کس طرح کہا گیا ہے اس کا نام پلاٹ ہے۔

ایک سچا ناول نگار اپنے ناول میں کہانی کا پورا منصوبہ پلاٹ میں نہاں رکھتا ہے اور اس میں اپنے اسلوب اور زبان کی چاشنی سے رنگ و روغن بھرنے کا کام کرتا ہے۔

ایک نظر میں اگر دیکھا جائے تو ناول کائر کی کہانی میں باہمی ربط نہیں دکھائی دیتا لیکن بغور دیکھا جائے تو ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ زمین سے انسانی رشتے کی کڑیوں سے ناول نگار نے اپنی کہانی کو پرویا ہے۔ انہیں اگر الگ الگ دیکھا جائے تو سارے قصے اور تمام کہانیاں

اپنے دائرے میں مکمل ہیں۔ یہ کہانیاں نہ تو ایک دوسرے کی نقل ہے اور نہ ہی ایک دوسرے کا بقیہ۔ ناول میں کوئی ہیرو نہ ہونے کی وجہ سے اس کے کرداروں کو اہم کردار یا غیر اہم کردار کہنا صحیح نہیں ہو گا۔

کائر کئی خاندانوں کی زندگی کی تاریخ کا ایک ریکارڈ ہے۔ یہ ناول مختلف نسلوں، طبقوں، ذاتوں اور مذہبوں کی نمائندگی کرتا ہے۔ ہر کردار اپنے ماحولیاتی پس منظر اور اس کے دور کے مطابق پیش کیا گیا ہے۔ ہر فرد کو سماج کے ایک رکن کے طور پر تکشی نے پیش کیا ہے۔

اس ناول میں کوئی ڈرامائی پہلو ہے نہ ہی کوئی سنسنی خیزی۔ پھر بھی ہر ایک باب اپنے آپ میں مکمل ہے۔ تکشی نے اس ناول میں کوئی خاص یا مربوط پلاٹ کی تعمیر نہیں کی بلکہ انہوں نے اپنے ناول کے ذریعے زندگی کے عمل کی نمائندگی کی ہے۔ واقعات کا یہ تانا بانا سماجی، سیاسی اور اقتصادی صورتحال کا مسلسل منظر نامہ ہے جو خاندانوں کے عروج و زوال کا اظہار کرتا ہے۔ اس میں استحصال کرنے والوں اور استحصال شدہ کی زندگی بیان کی گئی ہے اور ساتھ ساتھ مخلص سماجی اور سیاسی کارکنوں کے علاوہ بد عنوان حکام اور سیاسی رہنماؤں کی سرگرمیوں کو بھی بیان کیا ہے۔ "کائر کا پلاٹ اردو ناول "فسانہ آزاد" کی طرح ہے جس میں واقعات کا تسلسل نہیں لیکن کرداروں کے ذریعہ کہانی کو مربوط کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ناول "گؤدان" پریم چند نے سادہ اور مربوط پلاٹ سے منظم کیا ہے۔ اور یہ ناول پلاٹ کی مناسبت سے ایک مکمل اور دلکش ناول کہا جاتا ہے۔ ناول میں پریم چند نے اس کے مرکزی کردار ہوری کے ذریعہ کہانی شروع ہوتی ہے اور یہ کردار شروع سے آخر اس کی زندگی تک اس ناول میں گھومتی ہے اور اس ناول کا پلاٹ گاؤں اور شہر کی سرگزشت میں تقسیم ہے۔

یہ ناول حقیقی دنیا کے واقعہ کی کہانی ہے۔ پریم چند نے اپنے کرداروں کے ذریعہ اس زمانے کے ہندوستان کے کسانوں اور دیہاتیوں کی پورے زندگی کی تصویر پیش کی ہے۔ الغرض دونوں ناولوں کا پلاٹ جامع اور مربوط ہے۔

(3) موضوع

ہر ناول اپنے اندر موضوعات سمائے ہوئے ہوتا ہے۔ انہیں موضوعات کو ناول نگار اپنے قاری تک پہنچانے کی کوشش کرتا ہے۔ عام طور پر دو یا دو سے زائد ناولوں میں مماثلت موضوعات کی سطح پر ہی ہوا کرتی ہے۔ تکشی اور پریم چند کے ناول بھی یہی حال ہے۔ دونوں ناول نگار نہ تو ایک دور کے ہیں، نہ ہی ان کی زبان ایک ہے اور نہ ہی ان کا علاقہ ایک ہے پھر بھی دونوں ناول نگاروں کی تحریروں میں جو مماثلت پائی جاتی ہے وہ ان کے موضوعات کی سطح پر ہی ہے۔ پریم چند نے جہاں اپنے عہد کے سماجی و معاشی حالات کا خاکہ اپنے ناولوں میں کھینچا وہیں تکشی نے بھی کیرالا کے سماجی و معاشی صورتِ حال کی تصویر کشی کی۔ دونوں نے اپنی تحریروں میں مزدور طبقے اور کسانوں کی زندگی کو محور بنایا اور ان ہی موضوعات پر زیادہ تر کہانیاں لکھیں۔ ذیل میں ان دونوں ناول نگاروں کے مشہور ناول "کائر" اور "گئودان" کے موضوعات پر بحث کی جائے گی۔

تکشی کے ایک ہزار صفحات پر مشتمل اس شاہکار کا مرکزی خیال ایک شخص کا اس کے زمین سے رشتہ ہے جس میں وہ اپنی غذا حاصل کرنے کے لئے کاشتکاری کرتا ہے۔ یہ کوئی جامد رشتہ نہیں ہے، اس میں انسانی زندگی میں آنے والی تبدیلیوں کی وجہ سے بہت سی تبدیلیاں

واقع ہوتی ہے۔ یہ ایک تاریخی عمل ہے اور تکشی نے اپنے ناول میں اس تاریخی عمل کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس ناول میں تکشی نے بنیادی طور پر کیرالا کے معاشی، سماجی اور ثقافتی زندگی میں ہونے والی تبدیلیوں کو بیان کیا ہے۔ ناول کی شروعات ہی تبدیلی کے ایک اشارے سے ہوتی ہے۔

> "اے رومترھا مڈم کسی کو بسانے کے لئے دیتا ہے۔ یہ خبر سنکر کوڈنتھرا موتاثان جلدی وہاں گئے۔
>
> اسی معمولات نہیں ہے۔ اے رومترھا نسب میں ابھی تک کسی نے خاندان کے ساتھ نہیں بستے۔ کوئی پوجاری یا مندر میں جانے مہارت حاصل کرنے والی نے وہاں رہتے۔ وہ صرف برہموں کے لئے بنائے ہوئے گھر ہے۔"[23]

کوچوپلائی کی آمد جو کہ ایک کلاسی فائیر ہے زمین کا سروے کرنے کے لئے گاؤں پہنچتا ہے اور اس مسئلے پر وہاں کے اعلیٰ طبقے کا ردعمل وہاں ہونے والی تبدیلیوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ کہانی اس دور میں شروع ہوتی ہے جب سامراجی نظام کا وجود ہے۔ ہم چیراتا، کننوتھو، کوڈنتھرا، منگلا شیری، شیلانتی پیلل اور اسی طرح کے کئی سامراجی خاندانوں کی کہانی پڑھتے ہیں۔ تکشی نے سامراجی نظام کی بورژوا اور خفیف بورژوا نظام میں تبدیلی اور ان تبدیلیوں میں پیسہ کی منتقلی، سرمایہ کاری اور مزدوری کے نظام کے کرداروں کی بڑی خوبصورت تصویر کشی کرتے ہیں۔

23-کائر-تکشی ص-17

اس شاہکار ناول کا مرکزی خیال کاشتکاروں کی زندگی کے مسائل اور مزدوروں اور سرمایہ دار کی کشمکش اوران لوگوں کے زمیں سے رشتے بیان کیا ہے۔

اس ناول کا اصل موضوع کسانوں کی زندگی ہے۔اس ناول میں کسانوں کی سماجی و معاشی زندگی کے تمام پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ناول گؤدان میں ہوری کا کردار پورے سماج کا نمائندگی کرتا ہے۔ کہ اس میں سماج کی اچھائی اور برائی ہر چیز نظر آتی ہے۔اور پریم چند نے ہندوستان کے پورے کسانوں کی خواہشات اور ان کے خواب اپنے ناول میں بیان کیا ہے۔

اس ناول میں بیلاری گاؤں کے کسان ہوری اور اس کی بیوی دھنیا کی زندگی کو بیان کرتے ہوئے ناول آگے بڑھاتے ہیں۔اور کسان ہوری کی ایک پوری زندگی کی عکاسی ملتی ہے۔ یہ پریم چند کی حقیقت نگاری کی سچی تصویر کشی کی مثال ہے۔پریم چند نے اس ناول میں بیلاری گاؤں کے سماجی حالات اور رسم و رواج اور اس زمانے کا سماجی معاشرتی حالات کو ہوری کی زندگی کے ذریعہ پیش کیا ہے۔ الغرص دونوں ناول ایک ہی موضوع پر لکھے گئے ناول ہیں۔

(4) کردار نگاری

ناول نگار کرداروں کے ذریعے ہی اپنی کہانی پیش کرتا ہے۔ ناول میں حقیقی دنیا کی کہانیاں ہوتی ہیں اس لئے کردار نگاری میں ناول نگار جس حد تک حقیقت پسندی کا اظہار کرتا ہے اس حد تک ناول کامیاب سمجھا جاتا ہے۔ ان کرداروں کے ذریعے ناول نگار اس دور کے تہذیب و تمدن، زبان و کلچر، رسم و رواج، اقتصادی و معاشی حالات کا بیان کرتا ہے۔ ناول نگار جس طبقے کی زندگی کو اپنا محور بناتا ہے کردار بھی اسی کا ترجمان ہوتا ہے۔

ناول "کائز" ڈھائی سو سال پر محیط ہونے کی وجہ سے اس میں سینکڑوں کردار ہیں جن کا مکمل تجزیہ یہاں کرنا غیر مناسب ہو گا۔ اختصار اور جامعیت کی غرض سے چند اہم کرداروں کا ذکر یہاں کیا جاتا ہے۔

وٹھترہ کاشت کار

اس ناول میں کسی ایک شخص یا ایک مرکزی کردار کے بارے میں نہیں کہتے اس میں سماج ہے کردار۔ وٹھترہ کاشت ایک حاندان کا نام ہے۔ وہ لوگ مندر کے زمین میں کاشتکاری کئے ہیں۔ مندر کے پورے زمیں میں کاشتکاری کرنا ان لوگوں کا کام ہے۔

پالوترہ کاشت کار

پالوترہ کاشت کے خاندان میں کنچن نام کا کردار ہے جو ان کی کاشتکاری کا سب سے بڑا نگراں ہے۔ وہ لوگ نچلے طبقے کے لوگوں کی مدد کرتے ہیں۔

توما کاشت کار

توما ایک کسان ہے۔ وہ کاشت کاری میں نئے نئے طریقے کا استعمال کرتا ہے۔ وہ ایک جدید کاشتکار کی عمدہ مثال ہے۔ اس نے اس زمانے کے رواج (کام کے بدلے اناج) کو بدل اور کسانوں کو ایک دن پیسے اور دوسرے دن اناج دینے کی روایت قائم کی، جس سے کسانوں کو اپنی دوسری ضروریات کے لئے پیسے مہیہ ہو جاتے تھے۔

ناول "گؤدان" کی کہانی "کائز" کی طرح وسیع کینوس پر محیط نہیں ہے اس لئے اس کے کردار اتنے زیادہ نہیں لیکن پریم چند ہوری کے ذریعے ہندوستانی کسانوں کی زندگی کو پیش

کیاہے اور بیلاری گاؤں کے علاوہ شکر مل کے مزدور اور اور لکھنؤ کا مزدور طبقہ بھی ان کے ناول کا حصّہ ہیں اسی لئے گئودان میں بھی کردار لاتعداد ملتے ہیں۔ گئودان کے تمام کرداروں کا ذکر کرنا یہاں مناسب نہ ہو گا۔ یہاں "گئودان" کے اہم کرداروں کا تجزیہ پیش کیا جاتا ہے۔

ہوری:

ہوری اس ناول کا مرکزی اور اہم کردار ہے۔ ناول گئودان کی پوری کہانی اس کے گرد گھومتی ہے۔ پریم چند نے اپنے ناول میں ہوری کے ذرعے شمالی ہندوستان کے ایک بدحال کسان کا نقشہ کیاہے۔ ہوری ایک عام کسان ہے اور جو روایت پسندی مذہبی اور پرانی تہذیبوں کی پروردہ ہے۔ وہ جاگیر دارانہ نظام پر ایمان رکھتا ہے ۔ اس ناول میں ہوری انسانی نفسیات کی بڑی اچھی تصویر ہیں۔

> "کسان پکّا سوارتھی ہوتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں اُس کی گانٹھ سے رشوت کے پیسے بڑی مشکل سے نکلتے ہیں۔ بھاؤ تاؤ میں بھی وہ چوکس ہوتا ہے۔ سود کی ایک ایک پائی چھڑانے کے لیے وہ مہاجن کی گھنٹوں خوشامد کرتاہے۔ جب تک پورا یقین نہ ہو جائے وہ کسی کے بہکانے میں نہیں آتا، لیکن اس کی ساری زندگی قدرت کا پورا ساتھ دیتے ہوئے گذرتی ہے۔ پیڑوں میں پھل لگتے ہیں جنھیں سب کھاتے ہیں، کھیتوں میں اناج ہوتا ہے جو دنیا کے کام آتا ہے، گائے کے تھن میں دودھ ہوتا ہے جسے وہ خود پینے نہیں جاتی بلکہ دوسرے ہی پیتے ہیں بادل سے پانی برستا ہے جس سے زمین آسودہ ہوتی ہے ایسے حالات میں مذموم خود غرضی کی گنجائش کہاں؟

ہوری کسان تھا اور کسی کے جلتے ہوئے گھر میں ہاتھ سینکنا اس نے سیکھا ہی نہ تھا"۔(24)

دھنیا:

دھنیا اس ناول کا ایک اہم کردار ہے۔ وہ ہندوستان کی نیک سمجھ دار عورت ہے اور معاملے کو بڑے صاف اور بے باک انداز میں لیتی ہے۔ وہ زیادتی کو برداشت نہیں کر سکتی۔ اور پریم چند نے اس ناول میں ایک مربوط ہندوستانی عورت کی طرح دھنیا کو بیان کیا ہے۔ اس ناول میں دھنیا ایک روایتی ہندوستانی عورت ہے جو اپنے شوہر کا گھر صبر اور حکمت کے ساتھ چلاتی ہے۔ وہ اپنے شوہر کے انا کی تبدیلی کی نمائندگی کرتی ہے، وہ ایک ایسی شخصیت ہے جس کی مدد سے اس کا شوہر اپنی زندگی کی خواہشات اور نظریات کی تکمیل کرتا ہے۔ وہ اپنے شوہر کے ذات کی توسیع ہے۔ کئی بار اس کا شوہر اس کی بری طرح پٹائی کرتا ہے لیکن وہ سب کچھ جھیلتی ہے اور کچھ نہیں کہتی یہاں تک کہ اس کے شوہر کو آخر کار اس سے معافی مانگنی پڑتی ہے۔ وہ اپنے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے اپنے خاندان والوں سے پیار کرتی ہے اور سب کی مدد کرنے کے لئے تیار ہے یہ دیکھے بغیر کے کون کم ذات کا ہے اور کس کی کیا حیثیت ہے۔

گوبر:

ناول گئودان میں "گوبر" ایک باغی کردار ہے۔ یہ ایک نوجوان شخص ہے جو زندگی کی عظیم امتیازات رکھتا ہے۔ وہ اس بات پر یقین کرتا ہے کہ خدا صرف ہمارے وجود کے لئے ذمہ دار ہے اور جوہر نہیں ہے۔ جب ایک آدمی دنیا میں آتا ہے، تو وہ اپنی طاقت اور اختیار سے

24۔ گئودان۔ ص14

حاصل کرنے کی کوشش کر سکتا ہے۔۔وہ ایک عیش و آرام کی زندگی کا خواب دیکھتا ہے اور تبدیلی میں یقین رکھتا ہے۔ ان کے خواب اپنی زندگی میں عملی شکل لینے کا موقع حاصل کرتے ہیں۔ جب وہ شہر کی زندگی کو دیکھتا ہے، تو وہ اپنی زندگی کی صورت حال میں بہتری چاہتا ہے، یہاں تک کہ اگر وہ امیر اور خوشحال نہ ہو۔ لیکن جلد ہی وہ برے عادات کا شکار ہو جاتا ہے اور اپنی زندگی کو قابل رحم بنا دیتا ہے۔

گوبر کا کردار جدید تصوّرِ آزادی، مساوات اور زندگی کے بدلتے ہوئے رجحانات کا ترجمان ہے۔ مگر اس کے باپ ہوری کا کردار روایت پرستی اور قدامت کا غماز ہے۔ ہوری پرانی نسل اور اس کے تصورات کا حامل ہے مگر گوبر نئ نسل کی آواز ہے۔ وہ شہری زندگی کے مصائب سے دوچار ہوتا ہے۔ گوبر صاف اعلان کرتا ہے کہ معاشی استحصال کرنے والوں سے بغاوت ضروری ہے۔ اس کا یہ جملہ اس کے انقلابی سوچ کی سچی ترجمانی کرتا ہے۔ وہ اپنے باپ سے کہتا ہے:

> "نہ جانے یہ دھاندلی کب تک چلے گی۔ جسے پیٹ کی روٹی میسر نہیں اس کے لئے آبرو اور مرجاو سب ڈھونگ ہے۔ اوروں کی طرح تم نے بھی دوسروں کا گلا دبا دیا ہوتا، ان کا روپیہ مارا ہوتا تو تم بھی بھلے مانس ہوتے۔ تم نے کبھی دھرم کو نہیں چھوڑا، یہ اسی کا ڈنڈ ہے۔ تمہاری جگہ میں ہوتا تو یا تو جیل میں ہوتا یا پھانسی پا گیا ہوتا۔ مجھ سے یہ کبھی نہ سہا جاتا کہ میں کما کما کر سب کا گھر بھروں اور آپ اپنے بال بچوں کے منہ میں جالی لگائے بیٹھا رہوں۔"([25])

[25]۔ گؤدان۔ ص387

(5) اسلوب

اسلوب کے ذریعے ہی ایک ناول نگار اپنے قاری کو متاثر کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ ہر فن کار کا اپنا الگ اسلوب ہوتا ہے۔ اسی اسلوب سے اس کی انفرادیت کا پتہ چلتا ہے۔ اسلوب کے تحت ناول میں پیش کی گئی تکنیک، اس کی منظر نگاری، جزئیات نگاری وغیرہ کا تفصیلی جائزہ لیا جاتا ہے۔

ناول "کائر" کو تکشی نے ایک داستان یا ساگا کے اسلوب میں پیش کیا ہے۔ تکشی شیو شنکر پلائی نے خود کہا ہے کہ اس کہانی کا خاکہ ان کے ذہن میں برسوں سے کھلبلی مچائے ہوئے تھا لیکن وہ اسے کس ہیئت یا کس انداز میں پیش کرے اس کا تعین نہیں ہو پا رہا تھا۔ ایک رات ان کے ذہن میں مہابھارت کا خاکہ آیا اور اسی طرز میں اس کہانی کو پیش کرنے کی ترکیب ان کے ذہن میں پیدا ہوئی اور اسی پر عمل کرتے ہوئے انہوں نے تین سال کی کڑی محنت کے بعد یہ معرکۃ الآرا تصنیف قارئین کو پیش کی۔

ناول کائر کو تکشی نے بیانیہ انداز میں پیش کیا ہے۔ ایسا جیسے کوئی ہمیں کہانی سنا رہا ہو۔ مثال کے طور پر یہ اقتباس دیکھیے:

> "پھوپھی کی بیٹی سے شادی کرنے والا شخص ہے مُٹّاٹ کنج اچّن۔ کنج کی بات ہی ایک غضب کہانی ہے۔ چلئے اس کہانی کو شروع کرتے ہیں۔۔۔"([26])

پریم چند کا اسلوب اپنے دور کے ادیبوں کے مقابل مخصوص امتیازات کا حامل ہے۔ انہوں نے اپنی تخلیقات میں ایک سیدھا اور دلکش اسلوب استعمال کر کے نئے لکھنے والوں کو

---

[26]۔ کائر۔ ص87

متاثر کیا ہے۔ ان کا طرزِ بیان بھی ان کی شخصیت کی طرح سادگی پائی جاتی ہے۔ سادگی، بے ساختگی اور شگفتگی ان کی تحریر کے اہم خصوصیات ہیں۔ فراق گورکھپوری کے بقول، "ان کا طرزِ تحریر ہندوستانی معاشرت کا آئینہ دار ہے۔" پریم چند کے آخر دور کی تحریروں میں ہندی الفاظ کی بھرمار ملتی ہے۔ انہوں نے اردو کو اس کے فارسی رنگ سے ہٹا کر اپنے غیر مسلم معاشرے میں لانے کی کوشش کی۔ ان کی کوشش یہ تھی اردو کو ہندی سے قریب کر دیں اور یہ قربت تہذیبی و معاشرتی اتنی ہی ہو جتنی کہ الفاظ کی قربت۔

ان کی مکالمہ نگاری بھی کمال کی ہے۔ انہوں نے ہر طرز کے مکالمے کو بڑی کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ہر کردار کے مخصوص اندازِ گفتگو، لب و لہجہ کا فرق اور انفرادیت کو انہوں نے پوری طرح سے برتا ہے۔

ان کی زبان میں زندگی کے قریب کے تشبیہات و استعارات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ یہ تشبیہات عام اردو ادب کی فرسودہ روایتی تشبیہوں سے قطعاً الگ انداز کی حامل ہیں۔ اقتباس ملاحظہ ہوں:

> "مس مالتی مہتا کی تعریفوں کے پُل باندھ دیتی جیسے کوئی
> نومرید اپنے نئے عقائد کا ڈھنڈھورا پیٹتا پھرے۔"

> "دلوں میں جو آگ ہے وہ تو کمھار کے بھٹے کی طرح
> صرف اوپر کی طرف لیپا پوتی سے بجھنے والی نہیں۔"

مذکورہ جملوں میں استعمال تشبیہات کا جائزہ لیں تو پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنی تشبیہوں کا انداز اور ماخذ دیہاتی تجربات سے حاصل کرتے ہیں۔ ان کی تشبیہوں میں تخیل کم اور عملی ندگی کے نمونے زیادہ نظر آتے ہیں۔

پریم چند نے اپنے کرداروں کی مرقع کشی اس طرح کی ہے کہ ان کے اعمال بھی اسی بیان سے واضح ہو جاتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

> "سٹھانی کو جاتے دیر نہ ہوئی تھی کہ منگرو ساہ آپہونچے۔ سیاہ رنگ، توند کمر کے نیچے لٹکتی ہوئی۔ دو بڑے بڑے دانت سامنے جیسے کاٹ کھانے کو نکلے ہو۔ سر پر ٹوپی، گلے میں چادر، عمر پچاس سے زیادہ نہیں مگر لاٹھی کے سہارے چلتے تھے۔ گٹھیا کا عارضہ تھا۔ کھانسی بھی آتی تھی۔ لاٹھی ٹیک کر کھڑے ہوئے اور ہوری کو ڈانٹ بتائی "پہلے ہمارے روپے دے دو ہوری تب اوکھ کاٹو، ہم نے روپئے ادھار دیئے تھے دان نہیں دیا تھا۔ تین تین سال ہو گئے نہ سود نہ بیاج گر یہ نہ سمجھنا کہ تم میرے روپئے ہضم کر جاؤ گے، میں تمہارے مردے سے بھی وصول کرلوں گا۔"[27]

پریم چند نے یہاں جس انداز میں منگرو ساہو کے مکالمے کی مرقع کشی کی ہے اس سے ہر قاری کو پہلے سے ہی سمجھ میں آجاتا ہے کہ یہ شخص بہت ہی خطرناک اور خون چوس دیہاتی ساہوکار ہے جو غریبوں کی کمائی کو سود اور بیاج کی شکل میں ہضم کر جاتا ہے۔

---

[27]۔ گئودان۔ ص 301

پریم چند منظر کی نگاری کی بات کی جائے تو اس میں ہمیں کہیں انسانی معاشرے کی جیتی جاگتی تصویر نظر آئے گی تو کہیں دلکش مناظر فطرت۔ مندرجہ ذیل اقتباس میں ایک گاؤں کی معاشرتی زندگی کو بڑے سادہ انداز میں انہوں نے پیش کیا ہے:

"دیہاتوں میں دن بھر کےماندے کسان سرِ شام ہوتے ہی سو جاتے ہیں۔ سارے گاؤں میں سوتا پڑ گیا تھا۔ متھرا کے گھر کا دروازہ بند تھا۔ سلیا اسے نہ کھلا سکی۔ لوگ اسے اس بھیس میں دیکھ کر کیا کہیں گے۔ وہیں دروازہ پر الاؤ میں ابھی آگ چمک رہی تھے، سلیا اپنے کپڑے سکھانے لگی۔"([28])

پریم چند نے اپنے اندازِ تحریر سے تمام مناظر فطرت اور ہر موسم کو اپنی پاکیزگی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کی بیان کی شگفتگی نے ہی ان کی تخلیقات میں ایک نئی جان ڈال دی ہے۔

(6) زبان و بیان

ہر مصنف کی اپنی ایک خاص منفرد زبان ہوتی ہے۔ ناول میں ناول نگار اس زمانے کی مطابق، ناول کے لسانی نظام کا تانا بانا بنتا ہے جس زمانے سے اس ناول کی کہانی کا تعلق ہو۔ ناول نگار کا علم، اس کی طرزِ زندگی، اس کی عادت، اس کا مطالعہ، اس کی سوچ و فکر اور اس کی نفسیات ناول میں جھلک کر سامنے آتی ہے۔ عام لوگوں کے بیچ رہنے والے ایک ادیب کے لئے ان کی زبان میں ان کی زندگی کو پیش کرنا بہت آسان کام ہوتا ہے۔ ادب کے مطالعے کے بعد یہ بات واضح ہوتی ہے کہ تمام ناول اپنی زبان اور اسلوب کی بنا پر ہی منفرد اور ممتاز ہوتی ہیں۔

---

[28]۔ گئودان – ص499

ایک ادیب کی زبان، انداز، ان کی سوچ و فکر میں وقت کے لحاظ سے تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں چاہے وہ تکشی ہو یا پریم چند۔ مثال کے طور پر تکشی کی ابتدائی تخلیق "اور مہ یوڑے تیر نگل" (یادوں کے ساحل) میں طویل بیانیے اور جملے پائے جاتے تھے لیکن وقت گزرتے گزرتے ان کی تخلیقات میں ان طویل بیانیے کی جگہ چھوٹے چھوٹے مکالمون نے لے لیا اور قارئین کی اکتاہٹ میں کمی آنے لگی۔

تکشی کی زبان بڑی ہی سادہ سلیس اور عام فہم ہے۔ اسی وجہ سے ان کی زبان میں حقیقت جھلکتی ہے۔ تخیل پرستی اور مافوق الفطری عناصر ان کے ناولوں میں نہیں پائی جاتی اس لئے ان کی زبان عوام اور سماج سے جڑی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ ان سب کے باوجود ان کے الفاظ کے استعمال کرنے کے انداز میں تمثیل اور فینٹاسی کا ایک حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔

تکشی اور پریم چند دونوں کی یہ خاصیت رہی ہے کہ دونوں نے اپنے نچلے طبقے کر داروں کے مطابق ان کی اپنی زبان میں کہانیاں لکھیں۔ تکشی نے اپنی سادہ و سلیس زبان اور عام فہم تراکیب کے استعمال سے ہی آج تک ملیالم ادب میں اپنا مقام قائم رکھا ہے۔ تکشی نے جہاں جاگیر داروں کے ذریعے ایک ظالمانہ و حاکمانہ انداز کی اندازِ تکلم کا استعمال کیا ہے وہیں کلاسی فیئر (classifier) کے لئے اقتصادی علمیت سے بھرپور زبان کا اور کنجو دیوی کے ذریعے گھر گھر کام کرنے والی عورت کی زبان کا استعمال کیا ہے۔

پریم چند کی زبان بھی تکشی کی زبان کی طرح سادہ اور عوام کی زبان ہے۔ پریم چند کی زبان میں دیہاتی الفاظ اور دیہاتی محاورہ اور دیہاتی روزمرہ کا استعمال گؤدان میں دیکھ سکتا ہے۔ اور ان کے محاوروں میں حقیقت دیکھ سکتا ہے اور ان کے الفاظ میں عوامی لوگوں کی زبان

کی تصویر ملتی ہے۔ گئودان میں ان کی زبان پر بیلاری گاؤں کے عوامی لوگوں کی زندگی کی عکاسی ملتی ہے۔

پریم چند کی زبان میں نشیب و فراز پایا جاتا ہے۔ ان کی نگارشات کا ملاحظہ کیا جائے تو کہیں بلند خیالات کی ترجمانی ملتی ہے تو کہیں بالکل عوامی احساسات کی تصویر کشی دکھائی دیتی ہے۔ پریم چند نے ماضی کی یاد کو بھی حقیقت کے رنگ میں کردار سے ادا کروائے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

> "ہوری کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ دھنیا کی یہ نسوانی محبت اس تاریکی میں گویا چراغ کی طرح اس کی فکر مند صورت کو منور کر رہی تھی۔ دونوں کے دل میں گویا گذرا ہوا شباب جاگ اٹھا تھا۔ ہوری کو اس کی ڈھلی ہوئی عورت میں وہی نرم و نازک لڑکی نظر آئی جو پچیس سال پہلے اس کی زندگی میں شامل ہوئی تھی۔ اس گلے لگنے میں کتنا اتھاہ پریم تھا۔"

پریم چند کی زبان پر ہندیت اور دیہاتیت کی چھاپ لگی ہے۔ اس کو ہم ہندوستانیت یا عوامیت سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ ناول گئودان کا گہرا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات بھی عیاں ہوتی ہے کہ ناول کے بہت سے حصے ایسے بھی ہیں جو عمدہ ادبی اردو میں پیش کیے گئے ہیں، جن میں حسنِ تخیل، تشبیہہ و استعارہ اور حقائق کے جلوے بکھرے ہوئے ہیں۔

پریم چند کی زبان میں دیہاتی الفاظ، دیہاتی محاورہ، دیہاتی انداز اور دیہاتی روزمرہ کا استعمال ہوا ہے جس کی وجہ سے ناول میں گاؤں کی زندگی کی پوری چھاپ نظر آتی ہے۔ انہوں

نے دیہاتی روزمرہ کو فصیح زبان سے ملا کر زبان کو وسعت و عظمت عطا کی ہے اور معاشرتی زندگی سے ناول کو قریب تر کر دیا ہے۔ مثال کے طور پر:

"ہوری: میں تیرے باپ کے پاؤں پڑنے گیا تھا؟ وہی تجھے میرے گلے باندھ گئے؟

دھنیا: پتھر پڑ گیا تھا، ان کی سمجھ پر اور انہیں کیا کہوں؟ نہ جانے کیا دیکھ کر لٹو ہو گئے۔ ایسے کوئی بڑے سندر بھی تو نہ تھے تم۔"([29])

بغور دیکھا جائے تو پریم چند نے دیہاتی زبان کو بھی پوری طرح سے اپنے ناول میں پیش نہیں کیا۔ انہوں نے شاید اپنے قارئین کی مدد کے لئے اسے فصیح زبان سے جوڑ کر ایک نئی ترکیب میں اسے پیش کیا اور الفاظ دیہاتی ہی استعمال کیے تاکہ یہ لگے کہ پوری کی پوری زبان ہی دیہاتی ہے۔ مثال کے طور پر ان کا یہ جملہ دیکھیے:

"مہاجن اپنے روپے چاہتا ہے اسے تمہارے دکھڑوں سے کیا مطلب؟"([30])

اگر یہ جملہ اصل دیہاتی زبان میں ہوتا تو اسے اس طرح ہونا چاہئے تھا۔

"مہاجن اپنے روپے چاہت ہے وہ کا تمرے دکھڑن سے کا مطلب؟"

پریم چند کی زبان میں ہندی کے الفاظ کی بھی بہت بھرمار ملتی ہے۔ مثال کے طور پر موہ، دھرم، انرتھ، اِچھّا، دُشٹ، ایکادشی وغیرہ۔

---

[29]- گؤدان- ص214

[30]- گؤدان- ص306

ان دونوں ناولوں کی زبان کا جائزہ لیں تو یہ پتہ چلتا ہے کہ ناول حقیقی دنیا سے کتنی قریب تر ہے۔ تکشی اور پریم چند نے سماج کے مختلف سطح کے لوگوں سے ان کی اپنی زبان میں مکالمے کروائے ہیں۔ گؤدان میں جہاں ایک گاؤں اور وہاں کے غریب ان پڑھ کسانوں کی زندگی کو محور بنایا گیا ہے وہیں کائر میں زمیندار اور ساہوکاروں کی زندگی اور ان سے جڑے مزدوروں کا کردار بیان ہوا ہے۔ ہر ایک طبقے کی اپنی اپنی لسانی خصوصیات ہیں۔ جہاں برہمنوں کی زبان سنسکرت آمیز ہے وہیں کلاسی فائیر، وکیل وغیرہ کی زبان سے علمیت جھلکتی ہے، گؤدان میں پروفیسر مہتا کے کردار کے ذریعے مردانہ ثقافت کی زبان بیان کی گئی ہے اور غریب ان پڑھ کسانوں کی زبان سے عام اور غلط تلفظ والی زبان کی ادائیگی ہوتی نظر آتی ہے۔ ان سبھی باتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ زبان کے ذریعے سماجی مسائل اور سماج میں موجود ناانصافیوں اور بے قدریوں کا واضح منظر پیش کیا جاسکتا ہے۔

ناول "گوٗدان اور کائر" کا موضوعاتی مطالعہ

ذات پات:

ناول سماجی مسائل کا عکاس ہوتا ہے۔ ملیالم ادب کے ناولوں کا جائزہ لیا جائے تو کیشو دیو کا "ایل کار"، ایس کے پوٹّا کاّڈ کا "دیشاّنڈے کتھا"، تکشی کا "اینی پڑ کل"، پار پّرم کا "آکشتّلے پر وکل" وغیرہ ایسے ناول ہیں جو کیرالا کی وسیع تہذیب و تمدن اور مسائل کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ ہم کیرالا کے مختلف ذات، مختلف مذاہب اور مختلف طبقوں سے تعلق رکھنے والوں کو ان کہانیوں میں اپنی زندگی سے لڑتے ہوئے دیکھ سکتے ہیں۔1900 سے 1960 کے بیچ کا دور کیرالا میں تبدیلیوں کا دور تھا۔ ابتدا میں جہاں آزادی کی تحریک گاندھی جی کی قیادت سے آگے بڑھی اور پھر آزادی کے بعد ہندوستان کی نئی سیاست اور حکومت کی باگ ڈور خود ہندوستانیوں کے ہاتھ آگئی۔ ان سب حالات میں پورے ہندوستان کی طرح کیرالا میں سماجی، معاشی اور سیاسی تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔

"گوٗدان" اور "کائر" دونوں ناولوں میں ذات پات اور اونچ نیچ وغیرہ جیسے مسائل کو زندگی کی ایک اٹوٹ کڑی کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اس دور میں اس سماجی برائی کی وجہ سے اونچ نیچ اور چھوا چھوت جیسے غیر اخلاقیانہ رویے اور استحصال عام تھا۔ پریم چند نے اپنے ناول "میدانِ عمل" میں امر کانت کے کردار کے ذریعے ہر جنوں کے لئے آواز اٹھائی ہے۔ اسی طرح تکشی کے "رنڈاڈنگائی" میں بھی سماج کے

نچلے طبقے کے لوگوں کے لئے ہڑتال وغیرہ کا منظر پیش کیا گیا۔ پریم چند نے سماج کے نچلے طبقے میں رہنے والوں اور ہر جنوں کے سماجی مسائل اور ان کے حالات کی بہترین عکاسی کی ہے۔

سماج میں طبقاتی نظام بہت پہلے سے چلا آرہا ہے۔ اس دور سے ہی اعلیٰ طبقے کے لوگ نچلے طبقے کے لوگوں کا استحصال کرتے آرہے ہیں لیکن یہ نظام اتنا عام ہو چکا تھا یا سماج کے افراد اس بات کے اتنے عادی ہو چکے تھے کہ انہیں ان سب چیزوں میں کوئی نقص یا غلطی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ اعلیٰ طبقے کے لوگ نچلے طبقے کے لوگوں سے خدمت کروانے کے عادی ہو چکے تھے اور نچلے طبقے کے لوگوں کو یہ احساس بھی نہیں ہو رہا تھا کہ ان کے ساتھ ناانصافی، ظلم یا زیادتی ہو رہی ہے۔ یہی سماج کا سب سے بڑا نقص تھا۔ ہر ایک طبقہ اپنے عمل یا کام کے مطابق اپنا درجہ پاتا تھا۔ اسی طبقاتی نظام کا اثر ان کی زندگی اور شادی بیاہ جیسے رسم ورواج میں بھی جھلکتی نظر آتی تھی۔ ملیالم کا پہلا ناول "اندولیکھا" سماج کے اعلیٰ طبقے کے نائر خاندانوں کی کہانی اور ان کی زندگی کی عکاسی کرتا ہے۔ اس کی وجہ سے ناول سماج کے مختلف طبقوں کی کہانی سنانے کا ذریعہ بن گیا۔

1920 تک کیرالا کے اعلیٰ طبقے کی نمبودری خواتین کو ہی اپنے جسم کے اوپری حصے کو ڈھکنے کی اجازت تھی۔ نچلے طبقے کی عورتوں کو چاہے وہ کسی بھی ذات کی ہوں یا کسی بھی عمر کی ہو اپنے جسم کے اوپری حصے کو چھپانے کی اجازت نہیں تھی۔ اسے اس دور کے سماج کی زبوں حالی کی بہترین مثال کہا جا سکتا ہے۔

ناول گؤدان اور ناول کائر دونوں میں مختلف پہلوؤں سے اچھوتوں کے مسائل دیکھے جاسکتے ہیں۔ پریم چند اور تکشی نے اصلاح کی غرض سے ان مسائل کو متعارف کرایا ہے۔ ان دونوں نے ہندوستانی سماج کے اس بدنصیب طبقے کو بڑی ہمدردانہ اور انسانیت پسندانہ نگاہ سے دیکھنے کی کوشش کی

ہے۔ دونوں نے اپنے تخلیقات میں نچلے طبقے کی معاشی بدحالی کو بیان کیا ہے۔ ان دونوں ناولوں میں ہم دیکھ سکتے ہیں کہ کس طرح اعلیٰ طبقے کے لوگ نچلے طبقے کے لوگوں پر حکمرانی کرتے ہیں اور نچلے طبقے کے لوگوں کو اپنا غلام بنائے رکھتے ہیں۔ اس طبقے کے بچوں کو تعلیم حاصل کرنے پر پاپندیاں لگائی گئیں ہیں۔ ناول کائر میں اس کی اچھی مثالیں دیکھی جا سکتی ہیں:

"پریروں کے لئے، پُلیا کے لئے اور چوڑّا لوگوں کے لئے، یعنی پنچ ذات کے لوگوں کے ایک درسگاہ قام کیا جانے والا ہے۔۔۔۔

کنجن پلائی نے کرتاؤ سے کہا:

"اروکرتاؤ! جیسا کہ تم نے کہا یہ تو ایک بڑی مصیبت ہی ہے۔"

"ہاں، ادھکاری پرمب کی درسگاہ ایک مصیبت ہی ہے۔ اب دیکھ لو ہمارے گاؤں کی درسگاہ میں پڑھے کتنے لونڈے ہیں۔ ان کی تو ایک بڑی جماعت یہاں موجود ہے۔ لیکن مجال ہے کسی کی جو کوئی محنت مزدوری کرے؟ سفید پوشاک پہنے، کاندھے میں سفید کپڑا اڈالے، نہا دھوکے دھول مٹی سے بچ بچاتے گھومتے رہتے ہیں۔ پندرہ کے ہوئے نہیں داڑھی مونچ منڈوانے لگتے ہیں۔ ہاتھوں میں چھوٹا چھورا پکڑنے سے ہونے والا کھردراپن بھی نہیں ہے۔ پھر کہاں ان کے ہاتھوں میں محنت مزدوری کا کھردراپن ہو۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر یہ پریر، پلیا اور چوڑّا ذات کے بچے درسگاہ جانے لگے تو ان کی بھی حالت یہی ہوگی۔"

"ابے کرتاؤ! اس سے تو ہماری روزی روٹی بند ہو جائے گی"

"ہاں یہ بھی ہوگا۔"

"ارے یار! وہ اگر پڑھنا لکھنا سیکھ جائیں تو کھڑے ہو کر اپنا صحیح حساب کتاب مانگنے لگیں گے۔"

"ہاں یہ بھی ہو گا۔"

"اور بہت زمانے بعد کھیت کھلیانوں میں کام کرنے والے بھی نہیں ملیں گے۔"

"ہاں یہ بھی ہو گا۔"

کرتاؤ نے کہا:

"دیو پرانوں میں لکھا ہے کہ وہ لوگ پڑھ لکھ نہیں سکتے۔"([31])

لیکن ناول گؤدان میں پریم چند نے پوری طرح ظالموں اور مظلوموں کی زندگی بیان کی ہے۔ اس میں مختلف طبقات کے لوگوں کی زندگی ہے۔ ایک اقتباس دیکھئے:

"اتنا سننا تھا کہ دو چماروں نے لپک کر ماتا دین کے ہاتھ پکڑے اور تیسرے نے جھپٹ کر اس کا جنیو توڑ ڈالا اور اس کے قبل کہ داتا دین اور جھنگری سنگھ اپنی اپنی لاٹھیاں سنبھال سکیں دو چماروں نے ماتا دین کے منہ میں ایک بڑی سی ہڈی کا ٹکڑا ڈال دیا۔ ماتا دین نے دانت جکڑ لیے پھر بھی گھن کی چیز اس کے ہونٹوں میں تو لگ ہی گئی، اسے متلی ہوئی اور منہ خود بخود کھل گیا۔ اور ہڈی حلق تک جا پہنچی۔ اتنے میں کھلیان کے سب آدمی جمع ہو گئے، مگر تعجب تو یہ ہے کہ کوئی ان دھرم کے لٹیروں سے مزاحم نہ ہوا۔ ماتا دین کا برتاؤ سبھی کو ناپسند تھا۔ وہ گاؤں کی بہو

31-کائر-تکشی-ص277-278

بیٹیوں کو تاکا کرتا تھا۔ پس دل میں سبھی اس کی درگت پر خوش تھے۔ہاں ظاہرا لوگ چماروں پر رعب جمارہے تھے۔

ہوری نے کہا" اچھا اب بہت ہوا ہر کھوا، بھلا چاہتے ہو تو یہاں سے چلے جاؤ"۔

ہر کھوا نے بے خوفی سے جواب دیا" تمھارے گھر میں بھی لڑکیاں ہیں ہوری مہتو! اتنا سمجھ لو۔اس طرح گاؤں کی مرجاد بگڑنے لگی تو کسی کی آبرو نہ بچے گی۔"

ایک لمحے میں دشمن پر پوری فتح پاکر حملہ آواروں نے وہاں سے ٹل جانا ہی مناسب سمجھا۔لوگوں کی رائے بدلتے دیر نہیں لگتی۔اس سے بچے رہنا ہی اچھا ہے۔ ماتا دین قے کر رہا تھا۔ داتا دین نے اس کی پیٹھ سہلاتے ہوئے کہا"ایک ایک کو پانچ پانچ سال کے لیے بڑے گھر نہ بھجوایا تو کہنا۔پانچ پانچ سال چکی پسواؤں گا۔"([32])

اس اقتباس سے گاؤں میں ذات پات اور طبقہ جاتی اختلاف کا پتہ چلتا ہے۔ ماتا دین چونکہ داتا دین کا بیٹا ہے اور اعلیٰ ذات سے تعلق رکھتا ہے اُس پر کوئی جرمانہ نہیں ہوتا لیکن ہوری پر بار بار جرمانہ اس لئے ہوتا ہے کہ وہ کسان ہے اور چھوٹی ذات سے تعلق رکھتا ہے۔ جاگیرداری نظام میں یہی سب کچھ ہوتا ہے۔

جاگیر دارنہ نظام:

تکشی کے اندر جو فن کار نے جنم لیا تھا اس نے اپنے ناول "کائر" میں جنوبی کیرالا کے جاگیر دارانہ سماج کی زندگی اور وہاں کے لوگوں کی تکلیف کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ کسی بھی

[32] گئودان-ص405-406

سماج کی تاریخ کا مطالعہ کرنے کے لئے وہاں کی تہذیبی و ثقافتی تاریخ کا مطالعہ کرنا بہت ضروری ہوتا ہے۔ یہی تہذیبی و ثقافتی تاریخ ایک قوم کی سچی تاریخ مانی جاتی ہے۔ پریم چند کا "گؤدان" بھی دیہاتی کسانوں کی تہذیب و ثقافت کی آئینہ دار ہے۔ پریم چند نے جہاں اتر پریش کے بنارس کے ایک گاؤں کو اپنے ناول کا محور بنایا وہیں تکشی نے کیرالا کے ایک قصبے کوٹاناڈو کے ارد گرد اپنی کہانی کا تانابانا تیار کیا۔ یہ دونوں علاقے ایک دوسرے سے اتنے دور ہونے کے باوجود دونوں صدیوں سے چلے آئے جاگیر دارانہ نظام کی زہریلی چپیٹ سے محفوظ نہ تھے۔

تکشی کا "کائر" زمین اور دولت کو اچھی طرح بیان کرتا ہے۔ جبکہ "گؤدان" میں دولت کی شکل مختلف ہے۔ یہاں ہوری کے سارے کاشتکاری کے اوزار دولت کے زمرے میں استعمال ہوئے ہیں۔ یعنی گائے، بیل، دھان، کھیت وغیرہ ہوری کی دولت ہے۔ پریم چند نے اپنے ناول میں جھنگری سنگھ کے کردار کے ذریعے جاگیر دارانہ نظام کی نمائندگی کروائی ہے۔ جاگیر دارانہ نظام کے مطابق راجہ یا اعلیٰ طبقے کے لوگ نچلے طبقے کے لوگوں سے غلاموں کی طرح کام کرواتے اور زمین بھی ان کی اپنی ملکیت میں ہوتی، کام کرنے والوں کو سوائے کچھ پیسوں کے کچھ نہیں ملتا۔ تکشی کے کائر میں صدیوں سے سماج میں ہونے والے بدلاؤ اور اس سے انسانی سوچ و فکر میں پیدا ہونے والے تغیرات کو اہمیت دی گئی ہے۔

پریم چند کے ناول کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس سماج میں گائے مالداری اور جاگیر داری نظام کی نشانی ہے۔ ان دونوں ناولوں کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان میں ذات پات اور چھوا چھوت پوری طرح چھائی ہوئی تھی۔ پریم چند نے سماج میں برہمنوں کی اہمیت اور ان کا غلبہ اور گؤدان جیسے غیر مساوی رسم ورواج کے چلن کی طرف اشارہ کیا جاتا تھا۔

تکشی کے ناول "کائر" میں ہی نہیں بلکہ ان کے تمام تخلیقات میں جاگیر دارانہ نظام کے خلاف احتجاج کی گونج پائی جاتی ہے۔ سماج میں سر داروں اور برہمنوں کا پورا غلبہ پایا جاتا تھا کیونکہ انہیں دونوں طبقوں سے سیاسی و معاشی خوشحالی وابستہ تھیں۔ اس زمانے میں جو بھی ٹیکس یا دان دھرم میں دی جانے والی مال و دولت کا نظام ہوتا تھا سب برہموں کی ترقی اور خوشحالی کے لئے تیار کی گئی تھی۔

پریم چند کا ہوری اس جاگیر دارانہ نظام سے بے حد متاثر نظر آتا ہے جو کبھی اس کے خلاف آواز اٹھانے کی ہمت نہیں کرتا۔ تکشی نے اپنے ناول کائر میں ہوری کے جیسے کئی کرداروں کو پیش کیا ہے جن کے رگوں میں جاگیر دارانہ نظام خون کی طرح پھیل چکا تھا۔ کائر کی خاصیت یہ ہے کہ اس میں انہوں نے پوری نسل کی کہانی بیان کی ہے اور اس جاگیر دارانہ نظام کے زوال کو بھی بیان کیا ہے۔ پریم چند نے اپنے کردار گوبر دھن کے ذریعے اس جاگیر دارانہ نظام کے خلاف آواز اٹھانے والا، انقلاب کے خواب دیکھنے والا اور مزدوری اور تجارت میں کامیابی کے خواب دیکھنے والے ایک طبقے کی نمائندگی کی ہے۔ پریم چند کے اس کردار میں جوش وانقلاب کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے، پریم چند نے یہاں یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ ایک شخص جب اس قید و بند کے سماج سے دور ہوتا ہے اور نئی دنیا کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے اور وہاں کی ترقی اور آسائش کے مزے چکھتا ہے تب ہی اس میں بدلاؤ اور انقلاب لانے کی امنگ پیدا ہوتی ہے۔

ترقی پسند دور کے فنکاروں نے جس طرح جاگیر داروں کو پیش کیا تھا اسی طرح کے ظالم، انسانیت سے بے بہرہ اور استحصال کرنے والے جاگیر داروں اور ساہوکاروں کو تکشی نے اپنے ناول "کائر" میں پیش کیا ہے۔ انہوں نے ایک ایسے سماج کی تصویر کشی کی جہاں ایک طرف مال و

دولت کے پہاڑ پر بیٹھے خوشحالی کی زندگی گزارنے والے جاگیر دار اور ساہوکار ہیں تو دوسری طرف ایک وقت کی روٹی نصیب نہ ہونے والے غریب کسان اور نچلے طبقے کے لوگوں کی بد حال زندگی۔ اس کے باوجود اعلیٰ طبقہ ان نچلے طبقے کے استحصال میں پیچھے نہیں ہٹتا بلکہ ان سے جتنا حاصل ہو سکے اتنا لینے کی کوشش کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ کائر میں انہوں نے ان جاگیر داروں کو "پونّو تمبر ان" (پیارے آقا) اور "تیر و منس" (بھلے مانس) آشان (صاحب) ادھیکاری (مالک) جیسے نام سے ہی پکارا ہے۔

گئودان میں گاؤں کے پنچ اور برہمنوں کو جاگیر داروں کی جگہ پیش کیا گیا ہے۔ ان دونوں ناولوں کے مطالعے کے بعد یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ دونوں ناول نگاروں نے اپنے قاری کو یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ مالداروں اور جاگیر داروں کے پاس صرف مال و دولت اور اونچے مقام ہی ہیں یہ لوگ اعلیٰ کردار اور انسانیت سے بالکل عاری ہیں۔

ثقافت اور وطن پرستی:

ایک بہترین ناول نگار اپنے ناول کے ذریعے اپنی قوم اور اپنے وطن کی تہذیب و ثقافت کو بیان کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ثقافت ایک بہت ہی اہم چیز ہے۔ ہر زمانے کی اور ہر قوم کی اپنی ایک الگ اور منفرد ثقافت ہوتی ہے۔ ایک قوم کا رسم و رواج، ان کا مذہب، ان کی زبان، ان کا فن، رہن سہن، لباس، طرزِ رہائش، تجارتی طور طریقے، خورد و نوش کی چیزیں وغیرہ جیسی انسانی زندگی سے تعلق رکھنے والی چیزیں اس قوم کی ثقافت کہلاتی ہے۔

ناول گئودان میں پریم چند نے ہوری کے ذریعے اس دور کی ثقافت، وہاں کے سماج میں گائے اور کھیت کی اہمیت اور گئودان جیسے رسم ورواج کے چلن کو بیان کیا ہے۔

ناول میں ناول نگار ایک گاؤں کی جو منظر نگاری کرتا ہے اس کی اہمیت بھی بہت زیادہ ہے۔ ناول نگار اپنے ناول کے علاقے کی تصویر کشی ایک ایسی جگہ کے مماثل کرتا جسے اس نے دیکھا ہو، پرکھا ہو یا وہاں زندگی گزاری ہو۔ پریم چند اور تکشی دونوں ہی اپنے اپنے ناول میں پیش کیے گئے علاقوں کی تصویر کشی کرنے میں بہت کامیاب نظر آتے ہیں۔

ناول کائر کا جائزہ لیا جائے تو گئودان کے مقابلے اس ناول میں ناول نگار نے بہت زیادہ خاندانوں کی زندگی، کئی نسلوں کی کہانی بیان کی ہے جس کی وجہ سے اس میں کئی تہذیب، رسم و رواج اور زبان میں تبدیلیاں واضح نظر آتی ہے۔ گئودان میں ہوری کو موسم اور بارش کی غیر موجودگی کی وجہ سے پریشانی اٹھانی پڑتی ہے۔ پریم چند نے یہ بات بتانے کی کوشش کی ہے کہ یہ ساری چیزیں ایک کسان کی زندگی سے کس حد تک منسلک ہیں۔ ہوری کی موت ایک کسان اور اس کی بیوی کی بیکسی نہیں ہندوستان کے سارے کسانوں کی بے بسی معلوم ہوتی ہے۔ ایک غریب بے بس کسان جو اب مزدور بن گیا ہے اور جو مزدوری کرتے ہوئے اپنی جان دے دیتا ہے اس سے یہ مطالبہ کرنا کہ گاؤدان کردو ظلم کی انتہا معلوم ہوتی ہے۔ گئودان سے ایک اقتباس دیکھئے:

"آج ہوری کھُدائی کرنے چلا تو بدن بھاری تھا۔ رات کی تھکن دور نہ ہو پائی تھی مگر اس کے قدم تیز تھے اور چال میں بے پروائی اکڑ تھی۔

آج دس ہی بجے سے لوُ چلنے لگی اور دوپہر ہوتے تو آگ برس رہی تھی۔ ہوری کنکر کے ٹوکرے اٹھا اٹھا کر کان سے سڑک پر لاتا اور گاڑی پر لادتا

تھا۔ جب دو پہر کی چھٹی ہوئی تو وہ بے دم ہو گیا تھا۔ ایسی تھکن اسے کبھی نہ ہوئی تھی۔ اس کے پاؤں تک نہ اٹھتے تھے۔ بدن اندر سے جھلسا جا رہا تھا وہ نہ نہایا اور نہ کچھ چبایا۔ اسی تکان میں اپنا انگوچھا بچھا کر ایک پیڑ کے تلے سو رہا تھا۔ مگر پیاس کے مارے گلا سوکھا جاتا ہے۔ خالی پیٹ پانی پینا ٹھیک نہیں ہے۔ اس نے پیاس کو روکنے کی کوشش کی مگر ہر لمحہ اندر کی جلن بڑھتی جاتی ہے۔ اس سے نہ رہا گیا۔ ایک مزدور نے بالٹی بھر کر رکھ لی تھی اور چربن چبا رہا تھا۔ ہوری نے اٹھ کر ایک لوٹا پانی خوب کھینچ کر پیا اور پھر جا کر لیٹ رہا۔ مگر آدھا گھنٹے میں اسے قے ہو گئی اور چہرے پر مردنی سی چھا گئی۔

اس مزدور نے کہا "کیسا جی ہے ہوری بھائی؟"

ہوری کا سر چکرا رہا تھا۔ بولا "کچھ نہیں اچھا ہوں"

یہ کہتے کہتے اسے پھر قے ہوئی اور پھر ہاتھ پیر ٹھنڈے ہونے لگے۔ وہ گھبرایا۔ یہ سر میں چکر کیوں آرہا ہے؟ آنکھوں کے سامنے جیسے اندھیرا چھایا جاتا ہے۔ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور زندگی ساری باتوں کی یاد مجسّم ہو کر دل میں آنے لگی۔ مگر بے سلسلہ خواب کی تصویر کی طرح بے ربط اور بگڑی ہوئی۔ وہ خوشگوار بچپن یاد آیا جب وہ گلّیاں کھیلتا تھا اور ماں کی گود میں سوتا تھا۔ پھر دیکھا کہ جیسے گوبر آیا ہے اور اس کے پیروں پر گر رہا ہے۔ پھر منظر بدلا، دھنیا دلہن بنی ہوئی سُرخ چندری پہنے اسے کھانا کھلا رہی ہے۔ پھر ایک گائے کی تصویر سامنے آئی۔ اس نے اس کا دودھ دوہا اور منگل کو پلا رہا ہے کہ گائے ایک دیوی بن گئی اور................

اس مزدور نے پھر پکارا، "دوپہری ڈھل گئی ہوری، چلو جھوّا اٹھاؤ۔"

ہوری کچھ نہ بولا-اس کی روح تو نہ جانے کِس کِس دنیا میں اڑ رہی تھی۔ اس کا بدن جل رہا تھا اور ہاتھ اور ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو رہے تھے-لُو لگ گئی تھی۔"([33])

گاؤں میں موجود جاگیر داروں اور ساوکاروں کے ظلم و ستم اور مذہبی انا کی اس اقتباس میں انتہا نظر آتی ہے۔

کائر اور گوٗدان دونوں ہی ناولوں میں زمین کے حوالے سے کسانوں، مزدوروں کے بگڑتے حالات کو پیش کیا گیا ہے۔ کائر میں کئی نسلوں کا بیان ملتا ہے لیکن ہر نئی نسل پرانی نسل کی توسیع نظر آتی ہے کہ وہ اپنے سے پہلی والی نسل کے دکھ درد کو اپنانے پر مجبور ہے اور گوٗدان میں پریم چند نے ہوری اور دھنیا کے نظر ہندوستان کے کسانوں کی حالتِ زار کو پیش کیا ہے۔ دونوں ہی ناول انسانی دوستی کا پیام دیتے ہیں۔

[33] گوٗدان-ص586-587

بابِ چہارم

ماحصل

ماحصل

زندگی کی کشاکشی، سائنسی و صنعتی ترقی اور سرمایہ دارانہ و جاگیر دارانہ نظامِ زندگی نے ناول کو جنم دیا۔ جیسے جیسے انسانی زندگی کی جدوجہد تیز ہوتی رہی اور طبقاتی کشمکش میں ارتقا ہوتا رہا ویسے ویسے فن، موضوع اور مقصد کے لحاظ سے ناول کا حسن نکھرتا گیا۔ اسی کی وجہ سے لوگ پچھڑے طبقات کے سینکڑوں مسائل پر سوچنے پر مجبور ہو گئے۔ "پریم چند" اور "تکشی" دونوں نے نہ صرف عوام کے مشکلات کو محسوس کیا بلکہ ان کی زندگی کا بہت قریب سے مشاہدہ کیا۔ اور ایک زندہ ادیب کی طرح اپنے گردوپیش کے حالات سے باخبر رہے۔ انہوں نے سیاسی وسماجی بندشوں اور طبقاتی کشمکش کو سمجھا، غریبوں کی دکھ بھری داستانوں کو سنا اور ان کی آہ وبکا نے دونوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ دونوں نے اپنی آنکھوں سے کسانوں کی بگڑتی حالت اور مہاجنی و زمیندارانہ نظام کو دیکھا تھا اس لئے وہ اس موضوع پر قلم اٹھانے میں کامیاب ہوئے۔

اردو کے مایہ ناز ادیب پریم چند نے اپنے ناول "گؤدان" اور ملیالم کے مشہور فکشن نگار تکشی شیو شنکر پلائی نے اپنے ناول "کائر" میں ایک ہی موضوع کو الگ الگ زبانوں میں، الگ الگ زمانے میں اور الگ الگ علاقے میں بیان کیا ہے۔ دونوں اپنے ناول میں گاؤں کی عکاسی کرتے نظر آتے ہیں۔ دیہی زندگی کی طرزِ رہائش، ان کے مصائب و آلام، وہاں کے مالداروں کا مکر و فریب وغیرہ

جیسے ہر رنگ روپ کو دونوں نے نمایاں کیا ہے۔ ان دونوں کی تحریروں کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں گاؤں کی روح تڑپتی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہ مصیبت زدہ لوگ تکلیف سے نجات پانے کا سنہرا خواب دیکھتے ہیں لیکن انہیں ناامیدی اور مایوسی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ ان کے اکثر کردار نچلے طبقے کے ہوتے ہیں جو صرف تقدیر اور اندھی تقلید کے پھندے میں جکڑے ہوئے ہیں۔

دونوں فنکاروں کی تخلیقی قوت نہایت زبردست ہے۔ وہ اپنے کرداروں کے ذریعے ہمیں درد دل کا سبق دیتے ہیں۔ ان کے کردار خوشی کی تلاش میں رہتے ہیں لیکن وہ تقدیر کے سامنے کامیاب نہیں ہوتے۔ ان کے کرداروں کی قدامت پسندی، جھوٹی آن بان، مجبوری اور تنگ دستی ان کے ذہنی انتشار کا باعث بنتی ہے۔

پریم چند اور تکشی دونوں نے اپنے موضوعات کو عام زندگی سے منتخب کیا ہے۔ وہ تنگ نظر نہیں تھے۔ ذات پات کی قید ان کی نگاہوں میں کوئی اہمیت نہ رکھتی تھی۔ اس لئے دونوں نے غیر جانبداری سے مسائل کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ دونوں نے گاؤں کی زندگی کو قریب سے دیکھا تھا۔ اس لئے ان کی نگاہ میں وہاں کی سچی تصویر تھی۔ اسی لئے ان دونوں ناولوں میں وہاں کے مسائل بڑی وضاحت سے نظر آتے ہیں۔ انسان دوستی کی وجہ دونوں کے کردار ظلم و ستم، ناانصافی اور تشدد کے خلاف آواز اٹھاتے نظر آتے ہیں۔

سیاسی بیداری، صنعتی ترقی اور جدید تعلیم کی وجہ سے سماج میں در آنے والے سماجی و تہذیبی بدلاؤ وغیرہ پریم چند اور تکشی کے ناولوں کے موضوعات رہے ہیں۔ ان کو انہوں نے اپنے ان ناولوں میں پوری طرح برتنے کی کوشش کی ہے۔ یہ دونوں ناول نگار جانتے تھے کہ زندگی

کروٹ بدل رہی ہے اور جب بھی کسی چیز کی انتہا ہوتی ہے تو اس کا رد عمل اس کی ضد کی صورت میں ابھرنے لگتا ہے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ اونچے طبقے کے مظالم حد سے تجاوز کر رہے ہیں اور غریب کسان اور ادنیٰ طبقے کے لوگ طرح طرح کی اذیتوں کے شکار ہیں۔ اس لئے دونوں نے ایک حساس فنکار کی طرح ان سب چیزوں کو اپنے ناولوں کے ذریعے قاری تک پہنچانے کی کوشش کی۔

پریم چند اور تکشی دونوں ایک طرح سے ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے ہیں۔ پریم چند نے جہاں ترقی پسند تحریک کے پہلے اجلاس کی صدارت کی تھی وہیں ملیالم کے ترقی پسندوں میں تکشی شیو شنکر پلائی کا نام پایا جاتا ہے۔ پریم چند کے دیگر تخلیقات جو کہ ترقی پسند تحریک کے وجود میں آنے سے قبل لکھی گئی تھی لیکن ان کی تحریروں میں وہ بات پائی جاتی تھی جو ترقی پسند مصنفین کے مینی فیسٹو کا حصّہ تھے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ تکشی کی تحریریں پریم چند کی تحریروں سے اس قدر مماثل پائے جاتے ہیں۔

پریم چند اور تکشی کی تحریروں میں یہ مماثلت بھی پائی جاتی ہے کہ دونوں نے فکشن کو خواب و خیال کی دنیا یا اعلیٰ طبقے کی دنیا سے نکال کر جیتی جاگتی حقیقی دنیا میں لا کر رکھ دیا۔ دونوں نے اپنے گاندھی وادی یا آدرش وادی قدروں پر ایک نئی سماج کی تشکیل کے خواب دیکھے تھے۔

مختصراً اگر کہا جائے تو ان دونوں ناولوں میں اگر افتراقات کی تلاش کی جائے تو ہمیں سینکڑوں مل جائیں گے کیونکہ نہ تو یہ دونوں ناول ایک دور کی ہیں، نہ ایک علاقے اور نہ ہی ایک زبان کی۔ لیکن ان دونوں ناولوں کے ذریعے ناول نگار سماج کو جو بات کہنا چاہتا ہے یا جن موضوعات کا ان ناولوں میں ذکر ملتا ہے یا جس انداز میں دونوں ناول نگاروں نے اپنے ناول کو بیان کیا ہے جیسی چیزوں کا جائزہ لیا جائے تو ہمیں یہ بات پتہ چلتی ہے کہ دونوں ناول کافی مماثل ہیں۔

یہی نہیں شاید اسی لئے اردو اور ہندی ادب میں پریم چند کا جو مقام و مرتبہ ہے وہی مقام و مرتبہ ملیالم ادب میں تکشی شیو شنکر پلائی کو بھی دیا جاتا ہے۔ اس لئے یہ بات کہنا بالکل غلط نہیں ہو گا کہ تکشی شیو شنکر پلائی ملیالم ادب کے منشی پریم چند ہیں۔

کتابیات

1	پریم چند کا تنقیدی مطالعہ	مدن گوپال	اے جے آف سٹ-نئی دہلی	1988
2	پریم چند کا فنی و فکری مطالعہ	سید محمد عصیم	سوپر پرنٹر-انار کلی-دہلی	1983
3	پریم چند گھر میں	شورانی دیوی پریم چند	ہندوستانی پبلشینگ ہاوس-آلہ آباد	1952
4	پریم چند کی ناول نگاری	ڈاکٹر یوسف سرمست	الیاس ٹریڈرس پبلیشر بک سلیر-حیدرآباد	1987
5	ناول کیا ہے	ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی	نسیم بک ڈپو لکھنؤ-	1962
6	اردو ناول کی تاریخ	علی عباس حسینی	ایجوکیشنل بک ہاؤس-علی گڑھ	
7	اردو نثر کا تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر سنبل نگار	ایجوکیشنل بک ہاؤس-علی گڑھ	1990
8	بیسویں صدی میں اردو ناول	ڈاکٹر یوسف سرمست	ترقی اردو بیورو نئی دہلی	1995
9	ناول کی تاریخ اور تنقید	علی عباس حسینی	انڈین بک ڈپو-لکھنؤ	
10	ناول کی تنقیدی تاریخ	ڈاکٹر حسن فاروقی	رام نارائنلعل بنی مادھو الہ آباد	1949
11	پریم چند فکر و فن	قمر رئیس	پبلیکیشنز ڈویژن اوزارت حکومت ہند- نئی دہلی	

12	اردو کا افسانوی ادب	صغیر افراہیم	مسلیم ایجوکیشنل پریس- علی گڑھ	2010
13	اردو فکشن	آل احمد سرور	یونیورسٹی پبلی کیشنز ڈویژن- علی گڑھ	1973
14	ناول کا فن	ابوالکلام قاسمی	ایجوکیشنل بک ہاؤس- علی گڑھ	2010
15	اردو ناول کی تنقیدی تاریخ	احسن فاروقی	ادارہ فروغ اردو- لکھنؤ	1981
16	اردو ناول کا ارتقائی سفر	شہنشاہ مرزا		1983
17	اردو ناول کی تاریخ اور تنقید	علی عباس حسینی	ایجوکیشنل بک ہاؤس- علی گڑھ	1987
18	تاریخ ادب اردو	نورالحسن نقوی	ایجوکیشنل بک ہاؤس- علی گڑھ	2009
19	ناول کیا ہے؟	احسن فاروقی- نورالحسن ہاشمی	نسیم بک ڈپو- علی گڑھ	1976

1	اینٹے وکیل جیوتم (میری وکیل زندگی)	تکشی سیو شنکر پلائی	ساہیتیہ کاروبار سنگھم- کوٹایم	1963
2	اور مکلوڑے تیر نگلیل (یادوں کا ساحل)	تکشی سیو شنکر پلائی	ساہیتیہ کاروبار سنگھم- کوٹایم	1985
3	سوانح عمری تکشی	تکشی سیو شنکر پلائی	ڈی سی بکس	
4	اینٹے اور مکل	ڈاکٹر آرزو	ٹی بی بک اسٹال	
5	ملیالم بھاشا اور تعلیم	ڈاکٹر آر- وشواناتھن	ڈی سی بکس	
6	ملیالم ناول تکشی سے مکند تک	کے اشوکن	نیشنل بک اسٹال- کوٹایم	1982
7	اینڈے بالیہ کالہ کتھا (میرے لڑکپن کی کہانی)	تکشی سیو شنکر پلائی	منگلودیم پریس- ترشیو پے رور	1967

8	بہت کردار	تکشی	ڈی سی بک اسٹال-کوٹایم	1970
9	تکشی اور ملیالم ناول	پروفسر ایم پی پنی کر	ٹی بی بک اسٹال-کوٹایم	1983
10	ناول ادب کی تارخ	ایم پی پول	پورنا پبلیسز-کالی کٹ	1991
11	ملیالم ناول-19ویں صدی میں	ڈاکٹر جورج اروبیم	کیرالا ساہتیہ اکاڈمی	1996
12	تکشی اور ملیالم ناول	ڈاکٹر وی ایس شرما	کیرالا یونی ورسٹی	1988
13	بہت انسانوں کی کہان	تکشی	ڈی سی بک ہاؤس	1973
14	ملیالم ادب کی تاریخ	پی کے پر میشورن نائر	نیشنل بک اسٹال کوٹایم	1965
15	کائر	تکشی	نیشنل بک-کوٹایم	1985
16	میری پہلی کہانی	تکشی	ماتر بھومی ہفتہ وار	اگست1972
17	چمین	تکشی	نیشنل بک ہاؤس-کوٹایم	1965
18	اینیپڑ کل (سیڑھیام)	تکشی	نیشنل بک ہاؤس-کوٹایم	1979
19	رنڈیڈنگئی (دوسیر دھان)		نیشنل بک ہاؤس-کوٹایم	1950
20	تکشی سیو شنکر پلائی	کے ایم ماتیو	بھاشہ پوشنی	ڈسمبر1980
21	میری زندگی اور فن	تکشی	بھاشہ پوشنی	1990
22	تکشی نامی ایک انسان	ڈاکٹر پوانن	بھاشہ پوشنی	اپریل 1985
23	تکشی وئ	تکشی	کیرالا بھاشہ انسٹی ٹیوٹ	1997

George.K.M. Novel-Westerninfluence on Malayalam Language and literature. Sahitya Acadami New Delhi, 1972.

Panicker, Ayyappa. chronicler of Kuttanad. Universitty of Kerala, 1988.

DECLARATION

I, **Rajeesh Pangottil**, hereby declare that this dissertation entitled "**Novel Godan Aur Kayar ka Taqabuli Mutalia**" submitted by me under the guidance and supervision of **Prof. Habeeb Nisar** is an original research carried out by me. No part of this dissertation has been published, or submitted to any University/Institution for the award of any Degree/Diploma.I here by agree that my thesis can be deposited in Shodhganga/INFLIBNET.

Place: Hyderabad **Rajeesh Pangottil**

Date:

Sign of the student

Reg. no -16HUHL25

Certificate

This is to certify that dissertation entitled "**Novel Goudan Aur Kayar ka Taqabuli Mutalia**" submitted for the award of the Degree of Master of Philosophy (M.Phil) in the Department of Urdu, School of Humanities, University of Hyderabad, is the result of the original research carried out by **Mr. Rajeesh Pangottil** bearing the Reg. No. 16HUHL25 under my supervision and to the best of my knowledge and belief, the work embodied in this dissertation does not form any dissertation/thesis already submitted to any University or Institution for the award of any Degree/Diploma.

Hyderabad

Date: **Supervisor**

Head, Dept. of Urdu **Dean**

Novel Goudan Aur Kayar Ka Taqabuli Mutalia

(Comparative Study of Novel Godan and Kayar)

A Dissertation submitted to the University of Hyderabad in partial fulfillment of the requirements for the award of

Master of Philosophy (Urdu)

By

Rajeesh Pangottil

16HUHL25

Under the supervision of

Prof. Habeeb Nisar

Department of Urdu

School of Humanities

University of Hyderabad

Telangana-500 046

2018